اقبال نامہ

بسلسلہ مطبوعات بزم اقبال نمبر ۳

بزم اقبال

مُرتبہ

پُروفیسر محمد طاہر فارُوقی ایم اے

صدر شعبہ فارسی و اُردو آگرہ کالج آگرہ

رجسٹرار جامعہ اُردو آگرہ

معتمد اعزازی بزم اقبال آگرہ

ناشرین

شاہ اینڈ کمپنی تاجرانِ کتب حکیم وصی اللہ روڈ آگرہ

خواجہ فراست حسین مینجر
کے اہتمام سے آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ میں
طبع ہوئی

طبع اول　　مئی ۱۹۴۴ء　　قیمت تین روپیہ

فہرست

پیام	عالیجناب نواب محمد اسماعیل خانصاحب بار ایٹ لا ایم اے	
منظومات	....	۳ تا ۴۷
طائر طوبیٰ	حضرت مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی	۵
تشطیرات بر کلام اقبال	حضرت مولانا محمود اسرائیلی صاحب	۱۰
ترجمان خودی	جناب مولوی سید محمد عبدالرشید صاحب فاضل چھلیوی ایم اے	۱۴
مردِ قلندر	جناب پروفیسر آل احمد صاحب سرور ایم اے	۱۸
نذر اقبال	جناب منتخب صاحب جارچوی	۲۲
بال جبریل	جناب بشارت علی خانصاحب ارمان آفریدی	۲۵
یاد اقبال	جناب خواجہ محمد امیر صاحب صبا اکبرآبادی	۲۷
نوجوان مسلم سے	میاں محمد اطہر فاروقی ممتاز	۲۹
اقبال نہیں تو کچھ بھی نہیں	جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے	۳۰
صبح کربلا	جناب مغیث الدین صاحب فریدی ادیب کامل	۳۲
تضمین	جناب مغیث الدین صاحب فریدی ادیب کامل	۳۴
آئینہ تصویر درد	جناب مغیث الدین صاحب فریدی ادیب کامل	۳۶

مقالات

خطبہ صدارت	.....	۹ تا ۳۴
اقبال کا فلسفہ خودی	عالیجناب ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں صاحب نائٹ۔ ڈی لٹ	۴۱
اقبال اور عشق رسول صلعم	جناب محمد مرتضیٰ صاحب صدیقی انکم ٹیکس آفیسر	۵۷
ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حافظ	جناب مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی	۹۱
اقبال اور ان کا پیام	جناب پروفیسر مولوی حامد حسن صاحب قادری	۱۰۱
اقبال کا تصوف	جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے	۱۴۵
اقبال کا مومن	جناب ساجد حسن صاحب قادری ایم اے۔ بی ٹی (علیگ)	۱۶۳
اقبال کا تنوع	جناب زاہد حسن صاحب فریدی ایم اے	۱۸۵
اقبال کا شاہین	جناب ظہیر الدین احمد صاحب علوی ایم اے ایل ایل بی (علیگ)	۲۲۳
علامہ اقبال کا پیغام	جناب مغیث الدین صاحب فریدی	۲۳۷
	جناب مولوی محمد مظفر علی صاحب طالب ایم اے	۲۴۷

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

بزم اقبال

آگرہ کے کچھ علمی و ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار قائم کرنے کیلئے ۲ مئی ۱۹۳۸ء کو بزم اقبال آگرہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ بزم اقبال کے مقاصد میں اُردو زبان کی خدمت اور پیام و کلام اقبال کی اشاعت شامل ہیں۔ چنانچہ بزم کی نگرانی میں عام ادبی جلسے اور مشاعرے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ جن میں باہر سے بھی مقررین اور شعراء اکثر شرکت کیلئے آتے رہتے ہیں۔ ہر سال یوم اقبال بھی منایا جاتا ہے۔ خواہ ہمارا ہر جلسہ اعلیٰ اور شاندار پیمانے پر منعقد نہو۔ مگر اس کا ضرور لحاظ کیا جاتا ہے کہ جلسے کی ادبی شان امتیازی درجہ رکھتی ہو۔ چنانچہ آگرہ کے علمی و ادبی حلقوں میں بزم اقبال کے اجتماعات کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

بزم اقبال کے معتمد اعزازی کی تجویز و تحریک کے مطابق ۱۹۳۸ء ہی میں جامعہ اردو آگرہ کا خاکہ تیار ہوا تھا۔ جس کے مطابق ۱۹۳۹ء سے جامعہ اُردو کی تشکیل ہوئی۔ جامعہ کے امتحانات کے جو ہر سال نومبر کے مہینہ میں ہوتے ہیں، تین درجات قائم کیے گئے ہیں۔ ادیب۔ ادیب ماہر اور ادیب کامل۔ اور یو پی۔ سی پی۔ راجپوتانہ اور ریاست ہائے بھوپال۔ ٹونک اور رام پور

میں اس کے امتحانات کے مرکز موجود ہیں۔ اب تک جامعہ اردو پانچ امتحان لے چکی ہے۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ جامعہ کی شہرت، مقبولیت اور نیکنامی روز افزوں ہے۔ اگرچہ جامعہ اردو ایک مستقل اور آزاد ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس امر سے بھی انکار ناممکن ہے کہ اس جماعت کی بنیاد کا فخر بزم اقبال ہی کو حاصل ہے۔

بزم اقبال کے یہی عملی اقدام تھے جنکی بدولت سب کی توجہ اسکی جانب منعطف ہوئی اور ہمارے اکابر و عمائد میں سے حسب ذیل حضرات نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی۔

(۱) جناب مولوی سر محمد یعقوب صاحب مرحوم طاب ثراہ (سابق ممبر کونسل آف اسٹیٹ و مشیر اصلاحات دولت آصفیہ حیدرآباد دکن)۔

(۲) جناب ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں صاحب نائٹ ایم اے۔ لٹ ڈی۔ ایجنٹ جنرل حکومت ہند۔ جنوبی افریقہ۔

(۳) جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے۔ ایم ایڈ۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات۔ ریاست جموں و کشمیر۔

(۴) جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ شیخ الجامعہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ اوکھلا۔ دہلی۔

(۵) جناب کرنل ڈاکٹر ایم۔ اے رحمان صاحب آئی ایم ایس۔ ممبر فیڈرل پبلک سروس کمیشن دہلی۔

عرصہ سے ارادہ تھا کہ بزم اقبال کے جلسوں میں جو مقالات

پڑھے گئے ہیں ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات ان سے حظ اندوز ہو سکیں۔ اسی طرح یہ بھی خواہش تھی کہ دوسری علمی و ادبی کتابیں بزم اقبال کی جانب سے شائع کی جائیں۔ مگر مختلف دشواریاں سدِّ راہ تھیں اس لیے اب تک ممکن نہ ہوا۔ میں مکرمی سید بشیر احمد شاہ صاحب مالک شاہ اینڈ کمپنی آگرہ کا ممنون ہوں کہ ان کے تعاون و کرم نے اس مشکل کو آسان کیا۔ بزم کی مطبوعات جو پیش کی گئی ہیں اور جو فی الحال زیر طبع ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ حسرت موہانی۔ مصنفہ عبدالشکور صاحب ایم اے پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور۔

۲۔ ایرانی افسانے۔ مترجمہ مولوی حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ۔

۳۔ بزم اقبال۔ مرتبہ محمد طاہر فاروقی معتمد بزم اقبال آگرہ۔

۴۔ نئے اور پرانے چراغ۔ پروفیسر آل احمد صاحب سرور ایم اے۔ (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے بلند پایہ علمی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس کا شائقین کو عرصہ سے انتظار تھا۔ (زیر طبع)

۵۔ چند تنقیدیں۔ پروفیسر خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے (اسلامیہ کالج بریلی) کے ان تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو موقر علمی رسائل میں طبع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ (زیر طبع)

میرا خوشگوار فرض ہے کہ میں ان چاروں اصحاب کا شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے اپنی قیمتی تصنیفات بزم کے ذریعہ شائع کرنے کی اجازت دی۔

نیز ان صاحبان مقالات و شعرائے کرام کا جن کے بلند پایہ مضامین و منظومات اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ کہ انھوں نے بخوشی ان کی اشاعت کی منظوری عطا کی۔ ورنہ ممکن تھا کہ مجموعہ کی اشاعت کا خواب اب بھی منت کشِ تعبیر نہ ہوتا۔

اس مجموعہ میں صرف ان مقالات کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے جو حضرت علامہ اقبال طاب ثراہ کے پیام و کلام سے متعلق ہیں۔ ورنہ بزم کے جلسوں میں عام اردو ادبیات سے متعلق بھی بہت مقالات پڑھے جا چکے ہیں۔ اگر ان کتابوں کی اشاعت سعی مشکور سمجھی گئی تو آئندہ دوسری مفید کتابیں پیش کرنے کی ہمت ہو سکے گی۔

مجھے ندامت ہے کہ پروفیسر علوی صاحب اور مولوی مظفر علی صاحب کے مقالات اس مجموعہ میں صحیح مقام پر کتابت میں نہیں آئے۔ مگر یہ مضامین تاخیر سے موصول ہوئے اس لئے اس گناہ کی نوبت آئی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں بزرگ میری اس لغزش سے درگذر کریں گے۔

آگرہ
یکم مئی ۱۹۴۴ء

محمد طاہر فاروقی
معتمد اعزازی
بزم اقبال آگرہ

پیام

از

عالیجناب نواب محمد اسماعیل خانصاحب بار ایٹ لا، ایم۔ ایل۔ اے، صدر صوبہ مسلم لیگ یو۔ پی

مجھے بیحد خوشی ہے کہ آپ آگرہ میں "یومِ اقبال" منا رہے ہیں۔ اقبال کے پیام کی اشاعت اور اس کے خیالات اسلامی کی تبلیغ ہر مسلمان فرد اور جماعت کا فرضِ اوّلین ہے۔

اقبال دنیا میں محض ایک شاعر کی حیثیت سے روشناس ہے اور ہمارے ملک کے بہت سے افراد اس کو "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال اس شاعری کی دنیا سے بہت بلند ہے، جو محض "مذاقِ سخن" تک محدود ہے۔ اسکی شاعری بجا طور سے "جزویست از پیغمبری" ہے۔ وہ لوں میں

انقلاب پیدا کرتی ہے اور انسان کو مکمل انسان بننے کی دعوت دیتی ہے۔

مقصد شاعر اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است (اقبالؔ)

ہندوستان کے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور خود آگاہی کا جو جذبہ آج کل موجزن ہے اسکی تشکیل میں حضرت اقبالؒ کا خاص حصّہ ہے آج نہ صرف ہمارے خیالات و فکر میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ حیات ملیہ اسلامیہ میں زندگی کا بالکل نیا خون دوڑ گیا ہے۔ جس کو خود اقبالؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔

پس از من شعر من خوانند و در یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

محمد اسماعیل خاں

مخطوطات

طائرِ طوبےٰ

حضرت مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی

(۱)

نفس نفس کو جو سمجھا ہو دامِ صیّادی
سکونِ موت ہے اس کو پیامِ آزادی

وہ بوئے گل کہ جو پہونچی ہو اڑ کے جنّت میں
کہاں یہ تاب؟ کہ سمجھے چمن کی بربادی

اسیرِ عمر کی کل زندگی، اسیری ہے
کہ حرّیت کی نو فطرت نہیں ہے میعادی

حبابِ بحر کی موجوں میں کچھ نہیں بنیاد
ہے اعتبارِ طبیعت الم ہو یا شادی

وہ موج، ہاتھ میں جس کے، کوئی سفینا ہے
اسی کے ذوق سے مزا ہے اور جینا ہے

(۲)

قفس کی راہ میں جب بندِ آب و دانہ ہوا
جناں کو طائرِ لذّت نوا روانہ ہوا

قفس کے پاس۔ اسیرِ الم ادھر صیاد
اُدھر چمن کے غم، ہجرِ جاودانہ ہوا

رگِ فضا سے جو اُٹھا تھا نغمۂ دل دوز
زبانِ درد و الم پر وہی فسانہ ہوا

اُتر گیا کوئی بامِ نفس سے مرقد میں
کمالِ زیست ہی خود موت کا بہانہ ہوا

وہ روحِ پیکرِ "اقبال" غیرتِ اسلام
فرشتے لے چلے جب اسکو سوئے ربِّ انام

(۳)

ندا یہ آئی کہ اے عندلیبِ سحر نواز
حقیقتوں سے بھری ہے تری نوائے مجاز

وہ مشتِ خاک میں تیری تھی برق سامانی
کہ اُس نے دی ہے فرشتوں کو سرعتِ پرواز

ہوئی ہے دم سے ترے سرفراز پامالی
سکھائی مور کو پروانگیٔ بزمِ گداز

تری نوا سے رگِ جاں کا تار لرزاں ہے
نے عجم میں سنائی صدائے مستِ حجاز

دکانِ کفر کو دی، دیں کی گرم بازاری
بتانِ ہند سے پوچھے کوئی حرم داری

(۴)

بگاڑ کارِ وفا کا بتا دیا تو نے
جو تجھ سے روٹھ گیا تھا منا دیا تو نے

نہیں ہے لفظ تعین، حرم پرستوں میں
مقامِ وبعد کا پردہ اُٹھا دیا تو نے

وہ دل کہ دور تھا خود دانشِ غلامی سے
نظر کے سامنے لا کر دکھا دیا تو نے

جو پی کے سوئے تھے مغرب کا جامِ خوابِ سرشت
اُنھیں کا شانہ پکڑ کر جگا دیا تو نے

نئی لگن یہ ترے سوز نے لگائی ہے
لگا کے دل میں نمِ اشک سی بجھائی ہے

(۵)

وہی ہے ایک ہی سودا، کہیں ہو توانائی — سوادِ غرب کو دی ایشیا کی بینائی
نظر ہو جانبِ قبلہ، قدم کنشت میں ہو — بہ رادۂ ہوش تھی مغرب کی کام فرمائی
کہاں مزاجِ محبت کہاں جنونِ خرد — نگاہِ عشق میں ہے فلسفے کی گہرائی
شکست عقل کو دی، ذوق سے عقیدت کے — بہت بلند خرد سے ہے کیفِ دانائی

جو تار و پود تھا مغرب کا وہ بکھر دیا
غرض کہ تو نے زمانے کے رُخ کو پھیر دیا

(۶)

وہ شاعری کہ بنی رسم کی پرستاری — متاع جس کی تھی ذلّت، مآل تھا خواری
شراب رنگ تھا ساغر سرور سے خالی — یہی فریب تھا کل اہلِ بزم پر طاری
تمام اہلِ نظر کو دکھا دیا تو نے — کہ شاعری ہے حقیقت میں شانِ سرداری
جو لفظ میں نہیں طاقت تو ہیچ ہے معنی — کہاں ہو لفظ میں قوت جو دل ہو بیماری

تو شمع بن کے جلا، داغِ دل دکھانے کو
دکھا دیا جو دکھانا تھا کل زمانے کو

(۷)

طریقِ برق، تڑپنے میں اختیار کیا — کہ خود تڑپ کے زمانے کو بیقرار کیا
مآلِ کفر، دکھانا تھا کفر والوں کو — تمام عمر، قیامت کا انتظار کیا
یہی ہے غیرتِ ایمانِ عشق کا حاصل — کہ حسن نے جو کہا، اس کا اعتبار کیا
تری نظر میں، مقامِ بلند العنت تھا — عدو سے چھیڑ ہوئی دوستوں کو پیار کیا

عبودیت کو بتایا، مقامِ آقائی
یہی ہے ہوشِ مسلماں کی اصل دانائی

(۸)

بجائے خویش، تو خود اپنا اعتبار رہا — خزاں کے دَور میں بھی دامنِ بہار رہا
مجاہدانہ تھا اقدام سرفروشی کا — قلم کے سیف سے دائم ستیزہ کار رہا
ادا بتائی زمانے کو گلفشانی کی — تو دشمنوں کی نظر میں اگرچہ خار رہا
ہلا دیا تھا قفس تو نے قیدِ ہستی کا — کہ جنبشِ پرِ پرواز روزگار رہا

تری زباں پہ تھا ہر دم سبقِ اخوت کا
یہی ہے رازِ مسلماں کی اصل قوت کا

(۹)

سمجھ گیا تھا طرزِ شرارِ بولہبی — یہی ہے شیوۂ عشقِ محمدؐ عربی
مدارِ زیست سمجھتا تھا عشقِ سوزاں کو — تمام عمر ترے دل میں تھی یہ آگ دبی
سکونِ نفس جُدا تھا معاش جوئی سے — کہاں جگر کی تراوٹ کہاں یہ تشنہ لبی
ادب حیات کا ہے ذوقِ طرزِ نالہ کشی — سکونِ ضبط کو سمجھا تھا تو نے بے ادبی

تمام فرشِ زمیں کو ہلا دیا تو نے
"عرب" سے ہند کا ڈانڈا ملا دیا تو نے

(۱۰)

ہر ایک لفظ سے ظاہر تڑپ محبت کی — ہر ایک بات میں رنگینیاں قیامت کی
ہر ایک حرف میں پہلوئے دردِ بیتابی — ادا ادا تھی کہ چنگاریاں تھیں حسرت کی

تری نگاہ نے ظرفِ طلب کو پہچانا
بقدرِ جیبِ ادب بخششیں تھیں قسمت کی
بشر تھا اور مقامِ ملک کو جان لیا
اسی شعور کو کہتے ہیں دادِ فطرت کی

جمالِ شعر میں ہے نازِ حسنِ دلداری
بشرطِ آنکہ نگاہوں میں ہو طلبگاری

(۱۱)

وہی ہے شعر کہ جو آئینہ ہو فطرت کا
وہی سخن ہے کہ جو دل بنے طبیعت کا
وہی ہے بات کہ جو قلب میں اتر جائے
وہی ہے طرز کہ طوفاں ہو بحرِ حکمت کا
وہی کلام ہے جو خود کلیم بن جائے
وہی ہے زور کہ ہو جس میں ہاتھ قدرت کا
وہی ہے شان کہ جس پر نظر نہ ٹھہر سکے
وہی نظر ہے کہ جس میں ہو رُخ حقیقت کا

غرض کہ ذوقِ نظر نے ترے کمال کیا
کہ ذرّے ذرّے کو نظّارۂ جمال کیا

(۱۲)

تو روحِ "طائرِ طوبیٰ" تھا پیکرِ اقبال
نہیں ہے صورتِ انساں میں تیری کوئی مثال
زمیں کو چھوڑ کے آیا ہے آسماں کی طرف
کہ پست ہو کے رہے کیوں ترا بلند خیال
تو آ کے خلد میں اب عیشِ جاودانی کر
مقامِ جسم، تری روح کر چکا ہے نڈھال
چمک تو شاخِ طوبیٰ کے دل اگر چاہے
کہ اہلِ خلد کو بھائی ہے تیری طرزِ مقال

اُدھر کہ خلد کی رونق بڑھائی جاتی ہے
اِدھر ہے خاک کہ کیفی اُڑائی جاتی ہے

تشریحات بر کلامِ اقبالؒ

از

حضرت مولانا محمود صاحب اسرائیلی

(۱) غزل

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں نگاہ محققانہ، یہاں ہر انداز والہانہ

اُدھر ترقی، اِدھر تنزل، اِدھر تگ و دوادھر توکل
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا بہ اندازِ محرمانہ
میں تجھ سے اک رمزِ دہر کہہ دوں کہ تیرا مسلک ہے عارفانہ

نگہ مشیت کی دُور بیں ہے خرد کی آنکھیں ہیں بے بصیرت
سکندری ہو قلندری ہو یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
ہیں اُنکے اقوال جاہلانہ، ہیں اُنکے اعمال مجرمانہ

مجھے جو یقینِ ضبطِ پیہم دیئے رہے ہیں بطورِ ناصح
اُنھیں یہ ڈر ہے کہ میری نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
سمجھ رہے ہیں ہماری تقلید خود کریگا کبھی زمانہ
نہیں ہیں آزاد اب اگر ہم تو مر کے آزاد روح ہوگی
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بیکرانہ

خبر نہیں کیا ہے نام اسکا خدا فریبی کہ خود فریبی
مگر یہ توجیہہ تو یقیناً کوئی کہے گا نہ عاقلانہ
کہ ہمکو اسلام ہی سکھاتا ہے یہ جمود اور عیش کوشی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا
کہ تیرا دل بھی ہو ٹکڑے ٹکڑے جو اسکا سن لے کبھی ترانہ
غضب کیا تو نے اے ستمگر جو اسکو کنجِ قفس میں رکھا
کہ ایسے پُرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

---

(۲) دین و سیاست

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
نہ تھا اُسکی جھولی میں کچھ جز فقیری
وہ کب تھا سزاوار کشور کشائی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری!

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہاں ترکِ دنیا کہاں ملک گیری!
تفاوت تھا ان میں زمیں آسماں کا
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
وہ اسکو سمجھتی تھی دامِ اسیری
حکومت نے دانستہ سرتابیاں کیں
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
بسی بزمِ عشرت میں بوئے عبیری
قناعت کا دامن نہ کیوں چاک کرتی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی
فریبِ نظر اس کی یہ دل پذیری
دوئی طبعِ بے باک کی ناصبوری
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا
فقیری میں جس نے سموئی امیری
یہ دُنیا میں آکر اسی نے بتایا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
فقیری کے پرتو میں ہو ملک گیری
یہ مسلک ہی ہے امنِ عالم کا ضامن
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

---

(۳)

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رقصاں و خراماں و سبک رو و نواریز
میں نبض کی صورت گل و گلشن میں رواں ہوں
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز

پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے ہر غنچۂ نوخیز
جب دیکھتا ہوں سینۂ گلزار کو مجروح
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

---

(۴)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے

ترا ایماں ابھی کامل نہیں ہے
ہے اس کے دم ہی سے افسردہ محفل

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

نظر کے ذوق کا حامل نہیں ہے
نہ رہ اسکے سہارے کیونکہ یہ تو

---

(۵)

دُرّاج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دُرّاج

شہپر سے نہ کرنے کہیں گلشن ہی کو تاراج
دُرّاج کے بازو میں یہ قوت نہیں ہوتی

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج

دنیا میں ہے ردِّ عمل احساس کی معراج
مغرب میں سیاست کا نکلتا ہے جنازہ

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

وہ کشتۂ مظالم نے کیا تھا جسے تاراج
وہ صید کہ تھا بندِ غلامی میں گرفتار

ترجمانِ خودی

(اسرارِ خودی کا منظوم اُردو ترجمہ)

از

مولوی سید محمد عبدالرشید صاحب فاضل بجے پوری ایم۔ اے

الوقتُ سیفٌ

عنبر آگیں ہو الٰہی خاکِ پاکِ شافعیؒ — اک جہاں ہے سرخوش صہبائے تاکِ شافعیؒ
عرش سے لایا ہے تارے توڑ کر فکرِ رسا — وقت کو تعبیر جس نے تیغِ بُرّاں سے کیا
مجھ سے کیا تعریف ہو سکتی ہے اس تلوار کی — اسکی آب و تاب ہے سرمایہ دارِ زندگی
اسکے مالک کو نہیں اندیشۂ بیم و رجا — ہاتھ اسکا ہے یدِ بیضا سے بھی روشن ہوا
سنگِ خارا سے رواں چشمے ہوئے اسکی ضرب سے — یہ اگر چاہے تو دریا ایک دم صحرا بنے
حضرتِ موسیٰؑ کے قبضے میں یہی شمشیر تھی — معنیٔ تقدیرِ خالق جسکی ہر تدبیر تھی
چاک اسی نے سینۂ دریائے احمر کردیا — اک سمندر خشک مثلِ خاک ہو کر رہ گیا
پنجۂ حیدرؓ کہ جو مشہورِ خیبر گیر تھا — جانتے ہیں سب کہ مالک تھا اسی شمشیر کا
گردشِ گردونِ گرداں دیدنی ہے اے عزیز — انقلابِ روز و شب تیرے سمجھنے کی ہے چیز

کیوں اسیرِ دوش و فردا ہو گیا انساں ہے دیکھ
تیرے دل میں بھی نرالا اک جہاں پنہاں ہے دیکھ!

اپنے آب و گِل میں تو نے تخمِ ظلمت بو دیا
آہ غافل وقت پر تو نے گماں خط کا کیا!

لیکے اپنے ہاتھ میں پیمانۂ لیل و نہار
فکر تیرا ناپتا رہتا ہے طولِ روزگار

رشتۂ اوقات کو تو نے کیا زنّارِ دوش
عشق میں اصنامِ باطل کے گنوایا اپنا ہوش

کیمیا تھا تو۔ مگر اک تودۂ گِل ہو گیا
سرِّ حق پیدا ہوا تھا حرفِ باطل ہو گیا

تو مسلماں ہے تو بس اب توڑ دے زنّار کو۔
اور ضیائے شمعِ بزمِ ملّتِ احرار ہو

تو کہ سمجھا ہی نہیں نادان معنی وقت کے
کیسے واقف ہو حیاتِ جاوداں کے راز سے

روز و شب کی قید میں سمجھے گا کیا اندازِ وقت
لِیْ مَعَ اللّٰہ سے سمجھ گر ہے سمجھنا رازِ وقت

این و آں پیدا ہوئے ہیں وقت کی رفتار سے
زندگی خود راز ہے اک وقت کے اسرار سے

دیکھ! اصلِ وقت یہ خورشید ہو سکتا نہیں
وقت ہے جاوید یہ جاوید ہو سکتا نہیں

عیش و غم، عاشورہ اور یہ عید کیا ہیں؟ وقت ہیں
اور یہ تابِ مہ و خورشید کیا ہے؟ وقت ہے

وقت کو مثلِ مکاں تو نے جو سمجھا حیف ہے
اے مسلماں! امتیازِ دوش و فردا حیف ہے

ایکہ مثلِ بو کیا رم تو نے اپنے باغ سے
آپ ہی زنداں بنایا آہ! اپنے واسطے

وقت اپنا ہے نہ جسکی ابتدا و انتہا
جو ہمارے ہی ضمیروں کے خیاباں سے اُگا

زندہ ہو جاتا ہے اسکی معرفت سے زندہ تر
کیسا زندہ؟ جسکی ہستی صبح سے تابندہ تر

زندگی ہے یہ زمانہ اور زمانہ زندگی
اس پہ شاہد لَا تَسُبُّوا الدَّہر فرمانِ نبیؐ

تجھ سے میں کہتا ہوں نکتہ ایک روشن مثلِ دُر
تا کہ ہو جائے تجھے معلوم فرقِ عبد و حُر

عبد کو اپنے میں کر لیتے ہیں گم لیل و نہار
اور حُر کے دل میں ہو جاتا ہے گم یہ روزگار

عبد کا ہے مشغلہ بننا کفن ایام کا
اور روز و شب کی چادر اپنے اوپر تانتا

اور حُر اس آب و گِل کے دام میں پھنستا نہیں
بلکہ چھا جاتا ہے وہ کون و مکاں پر بالیقیں

عبد طائر کی طرح محبوسِ دامِ صبح و شام
لذتِ پرواز اسکی جان پر یکسر حرام

اور دیکھو سینۂ آزادہ چابک نفس
طائرِ ایام جس میں بند ہے ایسا قفس

عبد کی فطرت کا حاصل دیکھئے تو کچھ نہیں
واردات نو بنو سے بے خبر جانِ حزیں

ایک ہے اسکا گرانباری سے ہر لحظہ مقام
ایک حالت پر ہیں اسکے نالہ ہائے صبح و شام

کام ہے حُر کا مگر نو آفرینی دمبدم
تازہ نغموں سے ہمیشہ حامل اُسکا زیر و بم

فطرت اسکی بے نیاز زحمت تکرار ہے
راستہ کب اسکا مثلِ حلقۂ پرکار ہے

عبد کے حق میں زمانہ پاؤں کی زنجیر ہے
اور زباں پر اُسکی ہر دم شکوۂ تقدیر ہے

مردِ حُر کی ہمت عالی قضا کی راز دار
ہے اشارے پر اُسی کے گردش لیل و نہار

ماضی و آیندہ اسکے حال میں موجود ہیں
دیر ہوں کتنے مگر اسکے لئے سب زود ہیں

یہ سخن میرا اگر صوت و صدا سے پاک ہے
بے خبر اس جا خرد- عاجز یہاں ادراک ہے

حرف کا رونا کہ ہے معنی کے آگے شرمسار
شکوۂ معنی کہ ہے کب حرف اسکو سازگار

معنی زندہ جب آیا حرف میں مردہ ہوا
شعلہ اسکا سانس کی ٹھنڈک سے افسردہ ہوا

دل میں ہو پوشیدہ تیرے نکتۂ غیب و حضور
تیرے سینے میں نہاں ہے رمزِ ایام و مرور

نغمہ- خاموش رکھتا ہے جہاں میں سازِ وقت
غوطہ زن ہو دل میں تو پائیگا دل میں رازِ وقت

یاد ہیں ہمکو ابھی وہ دن کہ تیغ روزگار
تھی ہماری قوتِ بازو کی یار سازگار

جب دلوں کی سرزمیں میں ہم نے بویا تخم دیں
چہرۂ حق سے اٹھایا پردہ ہم نے بالیقیں

عقدۂ عالم کیا حل ناخنِ تدبیر سے
کھولدی قسمت جہاں کی نغمۂ تکبیر سے

بادۂ گلگونِ خمِ حق سے پیا جی کھول کر
اور پرانے میکدوں کو کر دیا زیر و زبر

اے کہ اب صہبائے دیرینہ تری مینا میں ہے
شیشہ بھی پانی ہو وہ گرمی تری صہبا میں ہے

کس لئے آخر تجھے یہ سخت و پندار ہے
کس لئے ہے طعنہ زن مسلم اگر نادار ہے

زیبِ محفل تھا ہمارا جام بھی اے بے خبر
ہم بھی رکھتے تھے کبھی سینے میں دل تو یاد کر

عصرِ نو جو سینکڑوں جلووں سے ہے آراستہ
یہ ہمارے ہی غبارِ پا سے ہے پیدا ہوا

کشتِ زارِ حق کو سینچا ہم نے اپنے خون سے
ہے جہاں ممنوں ہماری حق نمائی کے لئے

ہم نے ہی تو صاحبِ تکبیر عالم کو کیا
خاک سے اپنی رکھی ہم نے ہی کعبوں کی بنا

حرفِ اقرا حق تعالیٰ نے سکھایا تھا ہمیں
اور اپنے رزق کا قاسم بنایا تھا ہمیں

چھن گیا ہاتھوں سے اپنے آج گو تاج و نگیں
یہ گدا تیری حقارت کا مگر شایاں نہیں

تیری نظروں میں یہاں اندیش ہیں بیکار ہیں
بے سر و ساماں قدامت آشنا و خوار ہیں

ہم کو حاصل ہے مگر وہ اعتبارِ لا الٰہ
کائنات ہست و عالم رکھتے ہیں زیرِ نگاہ

واسطہ اب کیا غمِ امروز و فردا سے رہا
ہم نے باندھا ہے کسی کے ساتھ پیمانِ وفا

سینۂ عالم میں ہیں ہم سرِّ مکنونِ خدا
وارثِ موسیٰؑ و ہارونؑ ہم کو خالق نے کیا

چاند اور سورج میں ہے اب بھی ہماری آب و تاب
اب بھی رکھتا ہے ہزاروں بجلیاں اپنا سحاب

ذات ہے اپنی جہاں میں ذات حق کا آئینہ
ہستیٔ مسلم ہے بس آیاتِ حق کا آئینہ

مردِ قلندر

از

جناب پروفیسر آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے

ابھی مسعود کے ماتم سے سنبھلی بھی نہ تھی ملّت
خبر آئی کہ ہم سے ہو گیا اقبال بھی رخصت

وہ جس کے ساز سے بیداریاں بکھریں فضاؤں میں
وہ جس کے دم سے طوفاں جاگ اُٹھے ٹھنڈی ہواؤں میں

وہ جس نے خاکیوں میں عرشیوں کی عظمتیں بھر دیں
وہ جس نے خلوتوں میں محفلیں آراستہ کر دیں

ہر اک ساحل کو ہم آغوشِ طوفاں کر دیا جس نے
بیابانوں کو رشکِ صد گلستاں کر دیا جس نے

فرازِ لامکاں تک رفعتِ پرواز تھی جس کی
نوائے قدس سے ملتی ہوئی آواز تھی جس کی

جو محفل میں دکھانے کو بلوریں جام لیتا تھا
مگر ہر شعر سے شمشیر کا سا کام لیتا تھا

تمناؤں کو جا کر کوئے قاتل سے اٹھا لایا
جوانوں کو مے و ساغر کی محفل سے اٹھا لایا

چراغِ خانہ کو جس نے بنایا لالہ صحرا
جبینِ قطرۂ بے مایہ سے چھلکا دیے دریا

وہ جس نے آشیاں کی خاک میں چنگاریاں بھر دیں
رگوں میں خون کے بدلے تڑپتی بجلیاں بھر دیں

وہ ساقی جس کی مینائے سخن میں تیغ کی تیزی
وہ واعظ پند میں جس کی حسینوں کی دل آویزی

غبارِ رنگ و بو میں بجلیاں کھولے ہوئے پرچم
کبھی طوفاں، کبھی ساحل، کبھی شعلہ، کبھی شبنم

قدامت کا پجاری اور نئی دنیا کا متوالا
خدا کو ماننے والا، بتوں کو چاہنے والا

فقیرِ بے نوا تھا دل مگر شاہانہ رکھتا تھا
وہ عاشق تھا، مگر انداز معشوقانہ رکھتا تھا

وہ جس کے واسطے پیمانوں سے بوندیں چھلک آئیں
مدینے کی ہوائیں گلشنِ لاہور تک آئیں
وہ جس نے ڈوبتی نبضوں میں دوڑایا لہو اپنا
بیسا باؤں کے دل میں بھر دیا ذوقِ نمو اپنا
وہ جس نے حرّیت کے راز بتلائے غلاموں کو
وہ جس نے سجدے کے آداب سکھلائے اماموں کو
دلِ یخ بستہ کو ذوقِ عمل کی آنچ دی جس نے
ہجومِ یاس کو بخشی یقیں کی روشنی جس نے
قدامت کو جھنجوڑا عام دستوروں کے بت توڑے
خودی کی ضرب سے دُنیا کے مغروروں کے بت توڑے
حریمِ حسن میں جاکر رموزِ عاشقی کھولے
فقیہوں کے عمل انسان کی میزان پر تولے
وہ شاعر جس نے اسرارِ خودی کا راگ گایا تھا
وہ غازی موت کا منہ دیکھ کر جو مسکرایا تھا
وہ مے کش دے گواہی حور جس کی پارسائی کی
وہ مومن بندگی میں شان تھی جسکی خدائی کی
زعیمِ ملک و ملت، رہبرِ دیں، رندِ بے پروا
کلیمِ طورِ معنیٰ، علم کا بہتا ہوا دریا

وہ جس نے زندگی کو بخشی تابندگی ایسی
جسے خود موت کی ظلمت بھی مدھم کر نہیں سکتی
بشفق ہر شام کو اسکی لحد پر پھول لاتی ہے
نسیمِ جانفزا ہر صبح یہ نغمہ سناتی ہے
یہاں ملتا رہیگا سوز و سازِ آرزو برسوں
کیا ہے خونِ دل سے اک قلندر نے وضو برسوں

(رباعی)

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

(از بالِ جبریل)

نذرِ اقبال

از

جناب نخشب صاحب جارچوی

چشمِ شاعر ہے اسی طرح سے اب بھی بے خواب
چھیڑتی ہے رگِ احساس کو غم کی مضراب
کوئی دیتا نہیں فطرت کے سوالوں کا جواب
روز اٹھتی ہے یونہی روئے مشیت سے نقاب
کوئی اقبال سا اب دیکھنے والا ہی نہیں
"جلوۂ طور تو موجود ہے۔ موسیٰ ہی نہیں"

آج وہ گرمیٔ محفل کسی محفل میں نہیں
موجیں بیتاب ہیں جنبشِ لب ساحل میں نہیں

اب کوئی رہبر کامل رہِ منزل میں نہیں
شاید اسکا کوئی احساس کسی دل میں نہیں
تجھ میں آیا تھا جو دُنیا نئی دُنیا لیکر
"اب اُسے ڈھونڈھ چراغِ رُخِ زیبا لیکر"

اب وہ تحریر میں اقبال کا انداز کہاں
سرمدی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز کہاں
کیف اشعار میں وہ نظم میں اعجاز کہاں
نارہی ٹوٹ گئے ساز کے تو ساز کہاں
روح بیتاب ہے اردو کی مچلنے کے لئے
"طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے"

پردۂ شعر میں تصویرِ حقیقت رکھدی
طاقِ نسیاں پہ وہ فرسودہ حکایت رکھدی
سامنے قوم ہی کے قوم کی قسمت رکھدی
قالبِ شعر میں روحِ فن و حکمت رکھدی
مشعلِ نور اندھیرے میں جلائی کس نے
"بات بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے"

نظمِ تخلیق میں خود داریِ دنیا کیا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا کیا ہے
میں ہلاکِ غمِ امروز ہوں فردا کیا ہے
مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری تمنا کیا ہے

مرگِ اقبال سے وہ رنج و محن ہے مجھکو
"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھکو"

رباعی

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

(از بالِ جبریل)

بالِ جبریل

از

جناب مولوی بشارت علی خاں صاحب ارمان آفریدی

آج کسکو گوشۂ تربت میں سونپا جائیگا
کس مہِ تاباں کو مرقد میں اُتارا جائیگا
یہ نظارہ ہائے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا
قوم کا اقبال مٹی میں ملایا جائیگا

موت کو بھی ہے تعجب آج جینے پر ترے
دیکھ کسکی نعش ہے اے قوم کاندھے پر ترے

کون جاتا ہے یہ گورستاں بسانے کے لئے
کیا لئے جاتے ہیں مٹی میں ملانے کے لئے
کچھ تو چھوڑیں قوم مفلس کے خزانے کے لئے
کیا یہ دولت ہی بونہی لٹنے لٹانے کے لئے

یہ متاعِ بے بہا جو دفن کرکے آئینگے
کوئی ان ہاتھوں سے پوچھے کیا وہاں سے لائینگے

اے دلوں کی جان اے اقبال اے مطلوبِ قوم
اے امانت دارِ دردِ قوم اے محبوبِ قوم
عارفِ عرفانِ ملت قائدِ اسلوبِ قوم
جذب تیرا وقفِ ملت دل ترا منسوبِ قوم

قوم کا طالب بھی تھا اور قوم کا مطلوب بھی
تو مسلماں کے لئے یوسفؑ بھی تھا یعقوبؑ بھی

منتشر ہیں دل کے ذرے کوششِ تنظیم کر
از سرِ نو منضبط شیرازۂ تقویم کر
پھر پتنگوں کو تپش اندوزیاں تعلیم کر
قوم کے سینوں کو پھر تپش کی بجلیاں تقسیم کر

سچ بتا دے کیا وہ تیرے داغ سارے بجھ گئے
کیا لحد کی خاک سے دل کے شرارے بجھ گئے

تیری تربت پر یہ تاریکی ہے تو ہے مکینِ لحد
سوزِ پنہاں سے جلا دے شمعِ بالینِ لحد
تیرا پہلو اور فشارِ دردِ آگینِ لحد
اے شہیدِ قوم و ملت توڑ آئینِ لحد

بے زبانی کی زباں میں دعوتِ الہام دے
ہاں دہانِ قبر سے بھی اب کوئی پیغام دے

قوم ہے بے چین الہامی صدا کے واسطے
مضطرب ہے قافلہ بانگِ درا کے واسطے
سازِ ملت پھر ترستا ہے نوا کے واسطے
چھیڑ دے کوئی نیا نغمہ خدا کے واسطے

کیفِ یثرب اب عجم کے خم سے چھلکائے گا کون
سازِ ہندی پر حجازی لے میں اب گائے گا کون

قومِ مسلم اُف ہے کتنا پُر الم منظر ترا
آخری منزل پہ جا کر کھو گیا رہبر ترا
گرد آلودِ لحد ہے ضو فشاں اختر ترا
ملتِ بیضا شکستہ ہو گیا شہپر ترا

اب کہاں ذروں میں پروازِ خیالِ جبرئیلؑ
اب کہاں سے لائے گی یہ قوم "بالِ جبرئیل"

یادِ اقبالؒ

از

جناب خواجہ محمد امیر صاحب صبا اکبر آبادی

اسقدر ارزاں ہوئی ہے شعر کی جنسِ گراں
اب جسے دیکھو وہی ہے شاعرِ ہندوستاں

معنی و مطلب قابو ہے نہ قابو میں زباں
لطف مضموں سے تعلق ہے نہ احساسِ بیاں

سیکڑوں اچھے بھلے اس دُھن میں مجنوں ہو گئے
اک تخلص رکھ لیا دو شعر موزوں ہو گئے

نام لے کوئی تو آجاتی ہے تیوری پر شکن
اپنی شہرت کیلئے کرتے ہیں خود سو سو جتن

یوں دکھایا جاتا ہے طبع رسا کا بانکپن
کہتے ہیں ہم ہیں امام شعر آقائے سخن

میر و غالب، داغ و مومن طفلِ نو آموز ہیں
صرف ہم بزمِ سخن میں زندگی افروز ہیں

آہ یہ جہلِ مرکب آہ یہ قحط الرجال
بے کمالی ہو گئی ہے آجکل عین کمال

حیف یہ فنِ شریف اس طرح ہو پامال
جسکو کہتے تھے کبھی اہلِ جہاں سحرِ حلال

ہو گئی موزوں کلامی انتہائے شاعری
دزدِ مضموں بنتے جاتے ہیں خدائے شاعری

شاعری اک جوہرِ رنگیں ادا کا نام ہے
شاعری احساسِ دردِ بے دوا کا نام ہے

شاعری بیتابیِ ذوقِ وفا کا نام ہے
شاعری دراصل انعامِ خدا کا نام ہے

ہر کس و ناکس کو انعامِ خدا ملتا نہیں
شعر کہہ لیتے ہیں اور دلکو مزا ملتا نہیں

جو رگِ جاں کو نہ چھیڑے روح کو جنبش نہ دے
جو دلِ ہر ذرہ کو خورشید کی تابش نہ دے

جو سکوں ساما نیوں کو نعمتِ کاہش نہ دے
جو جمودِ زندگی کو دولتِ لرزش نہ دے

قوم کے دل بھی اثر میں جسکے رہ سکتے نہیں
کھنڈ کہہ سکتے ہیں اسکو شعر کہہ سکتے نہیں

ہند میں گذرے ہیں ایسے شاعرانِ باکمال
جنکی مشکل سے ملیگی غیر قوموں میں مثال

آسماں پیما تھا جنکا جوشِ پروازِ خیال
تھا تخیل جنکا وجہ زینتِ بزمِ جمال

وجد تھا ہر لفظ میں ہر شعر میں اک حال تھا
میر تھے غالب تھے وہ اک اور بھی اقبال تھا

یاد ہے اقبال کی ابتک دلوں میں جاگزیں
بات اسکی روح پرور شعر اسکے دلنشیں

عرش پایہ لفظ اسکے آسماں اسکی زمیں
فلسفہ اسکا غلام اور حکمت اسکی خوشہ چیں

آشنائے درد بھی تھا واقفِ لحت بھی تھا

وہ حکیمِ قوم بھی تھا شاعرِ ملت بھی تھا

بیخودی کے راز کہتا تھا بعنوانِ خودی — موت کی قیمت بڑھاتا تھا بزورِ زندگی
وہ سمجھتا تھا کہ کیا ہے رازِ صوتِ سرمدی — مستقل پیغام تھی دراصل اسکی شاعری

اسکی عظمت سے غرورِ قیصری پامال تھا
ہند میں پیدا ہوا وہ ہند کا اقبال تھا

نوجوانِ مسلم سے

(تضمین بر شعر علامہ اقبالؒ)

محمد اطہر فاروقی ممتاز

اے جلوۂ تہذیبِ فرنگی کے پرستار — بے روح ترا جام ہے بے نشہ ترا خم
جچتے نہیں تجھ پر اثرِ بادۂ توحید — وہ روح میں گرمی ہے نہ وہ دل میں تلاطم
مذہب ترے نزدیک ہے اک رسمِ پرستی — سجدہ ہے فقط کھیل، اذاں صرف ترنم
دل سے تری پوشیدہ ہے ایماں کی تجلی — الحاد کی ظلمت میں ہوئی تیری نظر گم
روتے ہیں ترے حال پہ اربابِ بصیرت — کرتے ہیں تباہی پہ تری غیر تبسم
ملتی نہیں کیوں تجھ کو رہِ منزلِ تسلیم — آتا نہیں کیوں بحرِ عقیدت میں تلاطم
آخر کوئی انجام بھی اس بے بصری کا — "بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم"

لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبالؒ نہیں تو کچھ بھی نہیں

از

جناب مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے

اقبال اک آیۂ رحمت ہے اقبال خدا کی نعمت ہے
اقبال سے زندہ ملت ہے۔ اقبال نہیں تو کچھ بھی ہے

افلاس و جہالت لاکھ سبب ہوں قوم کی پستی کے لیکن
فقدان عمل ہے مرگ امم۔ اعمال نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایمان ہے تیرا سرمایہ۔ ایمان متاعِ قابل ہے
کہنے دے انھیں جو کہتے ہیں "اموال نہیں تو کچھ بھی نہیں"

آئینہ ماضی بھی ہے یہی۔ اور شمع مستقبل بھی یہی
تو حال کو اپنے روشن کر گر حال نہیں تو کچھ بھی نہیں

اسرارِ خودی کا حافظ بن۔ پھر جادہ و منزل تیرے ہیں
ہے سہل وہی جو مشکل ہو۔ اشکال نہیں تو کچھ بھی نہیں
نغمات زبور کو گائے جا۔ مشرق کو پیام سنائے جا
ہاں درسِ عمل سکھلائے جا۔ اعمال نہیں تو کچھ بھی نہیں
جبریل بھی بن، انسان بھی بن، گر تجھ میں عزم و ہمت ہو
پرواز نہیں معراج کہاں اور بال نہیں تو کچھ بھی نہیں
اُٹھ زندہ ہو پائندہ ہو، اور ضربِ کلیمی پیدا کر
گر ضرب سے تیری پتھر بھی سیال نہیں تو کچھ بھی نہیں
پروردہ ماہ و سال نہ بن۔ خلّاق جہانِ تازہ ہو
محفوظ تجھے یہ پیغام اقبال نہیں تو کچھ بھی نہیں

(از بالِ جبریل)

صبحِ کربلا

(تضمین بر شعر علامہ اقبالؒ)

از

جناب مغیث الدین صاحب فریدی

وہی خورشید کی تابش وہی گرمی کا عالم ہے
فریدی۔ صبحِ محشر صبحِ عاشورِ محرم ہے

سوا نیزہ پہ کھنچکر حشر میں آجائے گا سورج
یہاں بھی لُو کے جھونکوں سے زمیں قعرِ جہنم ہے

وہاں قبروں سے اٹھیں گے ہزاروں سال کے مُردے
یہاں مُردہ اصولوں کو جلا دینا مقدم ہے

وہاں پرسش بھی ہوگی اور میزانِ عدالت بھی
یہاں پرسش نہیں ہے امتحاں لیکن مسلّم ہے

وہ میزانِ عدالت صرف ہوگی حشر کی زینت
یہ معیارِ شہادت عزّت افزائے دوعالم ہے

خدا والے اُٹھے ہیں نعرۂ تکبیر کہہ کہہ کر
سفیدیِ صبح کی زخمِ سیہ کاری کا مرہم ہے

پڑیگی آج بنیادِ وفا دُنیائے اُلفت میں
زمینِ کربلا پر اہتمامِ جشنِ اعظم ہے

حق و باطل کا جھگڑا طے کرینگے سبطِ پیغمبر
مرتّب پھر نئے سر سے نظامِ بزمِ عالم ہے

نویدِ نصرتِ اسلام دینے کو سحر آئی
شعاعِ مہر ہے یا ملتِ بیضا کا پرچم ہے

مگر اے مسلمِ خوابیدہ یہ کفرانِ نعمت کیوں!
تو اس ذبحِ عظیمِ کربلا پر وقفِ ماتم ہے

حکیمِ ملّتِ بیضا سے میں رمزِ شہادت کو
"اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"

تضمین

(بر غزل علامہ اقبالؒ)

از

جناب مغیث الدین صاحب فریدی

بقائے ہستی دل گرمیٔ آہ و فغاں تک ہے
قیام درد و پیہم اضطراب جانستاں تک ہے
جو ناکامی کی حد ہے زندگی میری وہاں تک ہے
"کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے"

نگاہ مست ساقی کا اشارہ بھی اگر پاؤں!
دو عالم کی بہاریں کھینچ کر ساغر میں لے آؤں
گھٹا ہو نسے اُٹھے بجلیاں نظر دنیٰ برساؤں
"وہ میکش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقی نامہرباں تک ہے"

نمود لالہ و گل ہے فریب خود نمائی تک
فروغ گلستاں ہے غم سے دل کی آشنائی تک
یہ سب رونق ہے آہِ نارسا کی نارسائی تک
"چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی سو میرے آشیاں تک ہے"

کہیں میں جستجوئے یار میں دم بھر بھی ٹھہرا ہوں — بگولہ بن کے اٹھا اور ہمہ دوشِ ثریا ہوں
ملی ہیں عشق میں یہ رفعتیں اب کیا کہوں کیا ہوں — وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے

پریشاں ہو کے مشکل سے مذاقِ غم نہ رسوا کر — "مصیبت ضبط کے آگے نہ آئے ضبطِ تمنا کر
خدا پر چھوڑ دے کشتی کو اپنی اور دیکھا کر — "سکونِ دل بھی سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے"

محبت میں سکوں سامانیاں جائز نہیں بالکل — "نہیں ملتی صراحی جام سے بے گریۂ قلقل
کیے جا نالۂ پیہم اگر ہے جستجوئے گل — "چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے"

حرارت ہو اگر دل میں تو ہو سب کچھ گوارا بھی — خلش بھی سوزِ غم بھی درد بھی دل کا تڑپنا بھی
غمِ فرقت کے صدمے بھی نشاطِ دل بھی جلوا بھی — "جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے۔

آئینۂ تصویرِ درد

(علامہ اقبال کی نظم تصویرِ درد کے ایک بند پر تضمین)

از

جناب مغیث الدین صاحب فریدی

مرے چہرہ پہ گردِ بیکسی ہے ترجماں میری
کوئی سمجھے تو معنی خیز ہیں خاموشیاں میری
تکلم آشنا ہونے نہیں پائی فغاں میری
"نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری"

مگر یہ عجب انداز دیکھا تیری محفل میں
لبِ فریاد ہو سکتا نہیں واتیری محفل میں
بھلا کوئی کرے کیا غم کا شکوا تیری محفل میں
"یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری"

بقیدِ ضبط بھی آنسو چھلک جاتے ہیں آنکھوں سے
فغاں بنکر زباں پر آگئے ہیں غم کی افسانے
شکستِ رنگ و بو بھی دیکھ لیتے ہیں نظر والے
"اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری"

مری فریاد سے پہلے نہ شکوے تھے نہ نالے تھے نوائے درد سے بیگانہ رہتے تھے چمن والے
کیا ہے میں نے سب کو آشنا ذوقِ تکلّم سے "اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے ملکر لوٹ لی طرزِ فغاں میری"

جمودِ بزمِ ہستی توڑ دینگے درد کے نالے بھڑک اٹھینگے آہِ نارسا کے عشق کے شعلے
تجھے محفل سے کیا مطلب فروغِ بزم رہنے دے "ٹپک اے شمع آنسو بنکے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری"

نہیں ممکن طلسمِ اختیار و خبر کا کھلنا سمجھ میں زندگی کا راز آیا ہے نہ آئے گا
خوشی پر اپنا قابو ہے نہ غم پر اختیار اپنا "الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری"

مرا دل آئینہ ہے قوم کے حالِ پریشاں کا نشانِ خستہ حالی چاک ہے میرے گریباں کا
مرا ہر اشک خونیں اشک ہے ملّت کے دامن کا "مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری"

مقالات

خطبۂ صدارت

از

عالیجناب ڈاکٹر سر شفاعت احمد خانصاحب

نائٹ، ایم اے، ایل ڈی

جس کو موصوف نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو یوم اقبال کے اجلاس میں پڑھا

میری اِس گذارش میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ آج میں اپنے آپ کو نہایت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ نے مجھے اِس بار رونق جلسے میں شرکت کی دعوت دے کر یہ اعزاز بھی دیا کہ میں اس عالی قدر جماعت میں ایک ایسی عظیم الشان اور مقتدر ہستی کی یاد میں آپ سب حضرات کے ساتھ شریک ہوں جس کو دنیائے حاضر کے زبردست ترین اور بزرگ ترین افراد میں شمار کرنا نہ صرف یہ کہ بے جا نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے اُس کی ہستی کو اُس کے حقیقی درجے سے کسی قدر پست کر دینا ہے۔ مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ میں اس یادگار زمانہ بزرگ کی یاد کے اس جلسے میں آپ کی سمع خراشی کرنیکا پورا اہل نہیں ہوں۔ لیکن میں نے آپ کے لطف و کرم سے اس خیال سے بھی سرتابی کی ہمت نہیں کی کہ میں آپ کے اس احسان سے فائدہ اُٹھا کر اقبالؔ جیسی موقر ہستی کی یاد میں شریک ہو کر نہ صرف ایک قومی اور ملّی بلکہ شخصی فرض بھی ادا کر سکوں گا۔ میں سچے دل سے آپ کی اس عنایت کا ممنون اور اپنے اس اعزاز پر نازاں ہوں۔

حضرات! مجھے خوب معلوم ہے کہ اقبالؔ جیسے شاعر، مفکّر اور مُصلح کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اور اس کا اظہار کرنا جہاں بے حد آسان ہے، بے انتہا مشکل بھی ہے اور حد درجہ نازک بھی۔ مجھے اس کا بھی احساس

ہے کہ میں ایسے اہل علم کی جماعت سے مخاطب ہوں جن کے سامنے اقبالؔ کے متعلق کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ لیکن اقبالؔ کی ہر دلعزیزی اور ہمہ گیری کی مثال بھی اسی سورج کی سی ہے جس سے دنیا کے سارے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب و غریب امر نہیں ہے کہ وہ جو اصل دنسل کا "سومناتی" ہو اور جس کے آبا "لاتی و مناتی" ہوں اور جس کی "کفِ خاک برہمن زاد" ہو وہ "روم اور تبریز کا رمز آشنا" ہو؟ کیا یہ امر واقعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ جو شخص "فلسفہ کا درس دے"، وہ "عشق ورزی" بھی کرے؟ کیا یہ ایک طلسمات نہیں ہے کہ ایک شخص یورپ کے آئینہ خانے میں مدتوں بسر کرے، وہاں کے خاص و عام، عالم و جاہل، پست و بلند کے ساتھ برسوں دوش بدوش رہے اور پھر "آباد ویرانہ" سے گھبرا کر اپنے "اُجڑے ہوئے وطن" کی طرف بھاگے اور درختوں کے سائے میں سونے اور کوئل کی کوک، پپیہے کی پکار، مور کی جھنکار سننے کی تمنا میں دیوانہ وار اپنے گھر پہونچے؟ کیا یہ سچ مچ ایک معجزہ نہیں ہے کہ ایک جدید تعلیم یافتہ خود مغرب میں رہ کر برسوں تعلیم حاصل کرے، جدید ترین فلسفہ کا مطالعہ کرے، سالہا سال دیوزادوں اور پری زادوں میں بسر کرے اور سرتاپا کافروں سے ہم دوش اور ہم عناں رہے، اور پھر ایسے ماحول سے سچّا اور پکّا مسلم اور مومن ہو کر نکلے؟ ان حالات پر غور کرنے والا اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ وہ انسان جو ان حالات میں پیدا ہوا اور رہا کسی طرح ایک معمولی انسان نہ تھا بلکہ ایک ایسا انسان تھا کہ وہ خود اپنے منہ سے کہہ سکتا تھا کہ ؏

جس پہ قدرت کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

اقبالؔ گریجویٹ تھے، اور وہ بھی ایک نہیں کئی یونیورسٹیوں کے، اور وہ بھی مشرق ہی کی نہیں بلکہ مغرب کی بھی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کو خوش نصیبی سے میر حسن، آرنلڈ، میک ٹیگرٹ، ڈنٹ جیسے فاضل، کامل اور شفیق اُستاد ملے، لیکن کیا اُنھیں تعلیم گاہوں سے اور انھیں اُستادوں کے قدموں سے اور ہزاروں افراد نہیں اُٹھے؟ ان مدرسوں اور ان استادوں کے کمالات اور فضائل سب مسلّم، مگر ان سے فائدہ حاصل کرنے والے کا جوہرِ ذاتی اصل چیز ہے۔ کمال جوہر ہی میں پوشیدہ ہوتا ہے، دوسرے اسباب اُسکے اظہار میں معاون ہوتے ہیں، اس کے موجد نہیں ہوتے۔ اقبالؔ کا یہ ذاتی جوہر شروع ہی سے قابلِ تحسین تھا، اور یہی ہر جگہ اور ہر رنگ میں چمکتا رہا یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری درخشانی کو پہونچا تو تیز نظر دیکھنے والوں کی بھی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اقبالؔ کی طبیعت کی وسعت اور ہمہ گیری کئی رنگ میں جلوہ گر ہے۔ اقبالؔ بہ یک وقت شاعر ہے، فلسفی ہے، مفکر ہے، مبصّر ہے، ناقد ہے، مصلح ہے۔ جہاں وہ شعر و سخن میں نئی راہیں پیدا کرتا ہے، اپنے فلسفے سے نئی رائیں قائم کرتا ہے، قوم کے مزاج کے فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سیاست کے میدان میں بھی گام زن ہے اور اُس کا مقام یہاں بھی بہت بلند ہے۔

اقبالؔ کی شاعری کا آغاز اُن کے وطن سیالکوٹ ہی میں ہوا۔ گو اُن کے اُستاد میر محمد حسن شعر گوئی کو اپنے شاگردوں کے لئے مناسب

نہ سمجھتے تھے لیکن اقبالؔ کی صلاحیتوں کا اُنھیں کافی اندازہ تھا، اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی ہمت افزائی کی، اور مناسب مشورے اور اصلاح سے صحیح ذوق پیدا کیا۔ لاہور کی صحبتوں نے اُس ذوق کی اور پرورش کی۔ اقبالؔ کی فطرت کی اُفتاد، طبیعت کی موزونیت، اور جذبات کا جوش اُنھیں شعر کہنے پر مجبور کرتا تھا۔ مگر وہ اپنے شعر و سخن کو اپنے حلقۂ احباب ہی تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مُشک کب تک چھپائی جا سکتی ہے؟ خوشبو پھیلی، اور ایسی پھیلی کہ مقامی مشاعروں سے نکل کر تمام ہندوستان پر چھا گئی۔ شروع شروع میں وہ اپنی غزلیں اصلاح کے لئے داغؔ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی داغؔ نے کہہ دیا کہ اُن کی غزلوں میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔ درحقیقت اقبال تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ اُن کی شاعری کسی استاد کی یا شاگردی کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ خداداد ذہانت اور الہامی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ تاہم ان کی بلند فطرت نے اس ذرا سے تعلق کو عمر بھر فراموش نہیں کیا، بلکہ "شاگردیٔ داغِ سخن داں" پر فخر کرتے رہے۔ داغؔ کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شاگرد کیا بننے والا ہے۔ وہ بھی اقبالؔ کی شاگردی پر کچھ کم نازاں نہ تھے۔ میدانِ غزل کی شہسواری اقبال کا مطمحِ نظر نہ تھی۔ یہ عقابِ تُند رفتار بلبل کی طرح شاخِ گل پر آشیانہ بنا کر بیٹھ جانا نہ چاہتا تھا! وہ تو وقتی جذبات، اور خواب آور محسوسات سے اوپر، بہت اوپر، کچھ اور ہی بلندیوں میں اُڑنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ یہ غزل تو یہی تو صرف مشق کے لئے تھی، شاعر کی نظریں اُفق میں وسیع تر وادیاں، باجبروت پہاڑ

اور فلک شکوہ چوٹیاں دیکھ رہی تھیں جن پر مستانہ وار دوڑنے کے لئے شاعر کا دل مچل رہا تھا۔ جب اقبال کو اپنے قلم کی طاقت پر بھروسا ہو گیا، تو انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی، اور نظم کے زیادہ وسیع اصناف کی طرف متوجہ ہوئے۔ غزل میں بھی اُنھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی، اور مرزا ارشد گورگانی جیسے استادوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔ جو غزلیں داغ کے رنگ میں کہی ہیں، ان میں معاملہ بندی، فصاحت، سلاست اور روانی کے دریا بہا دیئے ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا ایک شعر ہے:

تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

سب سے پہلی نظم جس نے ملک کی توجہ اس نئے شاعر کی طرف پھیری "ہمالہ" تھی۔ اُس زمانے میں قومیت اور حبِ وطن کا جذبہ ہندوستانیوں میں نیا نیا پیدا ہوا تھا؛ اس لئے یہ نظم بہت مقبول ہوئی، اور اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ اُن کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ پروفیسر نکلسن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "اقبال کی شاعری مشہور انگریزی شاعر شیلے کی یاد دلاتی ہے"۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اُن کی ذہنی کیفیت اور شیلے کی افتادِ طبیعت یکساں نظر آتی ہیں۔ اقبال کو یہ تو احساس ہے کہ اُن کا ایک مشن ہے، لیکن وہ دراصل ہے کیا، اِس کی ابھی کچھ خبر نہیں۔ شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ، دریا، سورج، چاند سب اپنے سینے میں کوئی راز چھپائے ہوئے ہیں۔ حقیقت کی تلاش میں وہ ہر شے سے مخاطب ہوتا ہے، ہر ہر چیز سے پوچھتا ہے۔ کبھی وہ شمع سے پوچھتا ہے کہ پروانہ اُسے

پیار کیوں کرتا ہے؟ کبھی وہ گلِ رنگیں کر یہ کہہ کر پھسلاتا ہے کہ اُس کی نظر "غیر از نگاہِ چشم صورت بیں" نہیں کہ شاید اسی طرح وہ اپنا راز اُگل دے۔ کبھی وہ ہمالہ کی زبان سے "اس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا" سُننا چاہتا ہے جس پر "غازۂ رنگِ تکلف کا داغ نہ تھا" "خفتگانِ خاک" کی طرف سے گذرتا ہے تو اُنھیں کی کیفیت پوچھنے لگتا ہے۔ تاہم ہر چیز اُسے کچھ نہ کچھ بتا ضرور دیتی ہے۔ کہیں سے اُسے "تلاشِ مُتصِل" کا سبق ملتا ہے، کہیں "حُسنِ ازل" اور "وحدت وکثرت کے راز" سمجھائے جاتے ہیں، کہیں وہ "مآلِ حُسن" دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہے۔ لیکن ان چیزوں میں ابھی اُسے کوئی سلسلہ نظر نہیں آتا؛ ہر چیز ایک دوسرے سے بے تعلق معلوم ہوتی ہے، اور ایک مختلف پیغام سناتی ہے۔ اِس کثرت میں شاعر کو اُس وحدت کی تلاش ہے جو نہ صرف اُسی کیلئے "سامانِ جمعیت" بلکہ "شمعِ جہاں افروز" بھی ہو۔ اسی سرد دی و سرگرمی اسی بے قراری و بے تابی میں وہ جل رہا ہے اور "کسی پہلو کل نہیں پڑتی" وہ "زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں" ہے اور "وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشان" کبھی کبھی تو وہ اس زندگی سے جو "سراپا سوز و سازِ آرزو" ہے گھبرا اُٹھتا ہے اور پھول کی قسمت پر رشک کرنے لگتا ہے کہ اُسکی زندگی "بے گدازِ آرزو" ہے، اور وہ "زیبِ محفل" ہوتے ہوئے بھی "شریکِ شورشِ محفل نہیں" جب دیوانگی کے جوش سے تنگ آجاتا ہے تو "محیطِ آبِ گنگا" سے التجا کرتا ہے کہ اُسے ڈبو دے۔ کبھی کبھی

اُس پہ یاس بھی طاری ہو جاتی ہے، اور وہ کہنے لگتا ہے: ع

اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ابھی اس کا نغمہ "جبرئیل آشوب" نہیں ہے، صرف "صدائے درد" ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو یاسیت میں غرق نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے پر و بال کی تاب و طاقت کا جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر اطمینان کا گہرا سانس کھینچتا ہے۔ اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُسے کبھی کبھی بجلی کی چمک نظر آتی ہے۔ بہت سے دردوں کا مداوا تو اسے بلال کی پیروی میں نظر آتا ہے جو عشق میں "تڑپتا تھا لیکن ایک دم کے لئے بھی قرار نہ لیتا تھا"۔ ایسے موقعوں پہ اُسے "کشودِ عقدۂ مشکل" میں لذّت ملنے لگتی ہے، اور وہ اپنی "سعیٔ بے حاصل" ہی میں "لطفِ صد حاصل" پاتا ہے۔

اسی زمانہ میں اقبالؔ کے قلم سے "ترانۂ ہندی" اور "میرا وطن وہی ہے" نکلتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین کی "نفاق انگیزی" پہ نالاں ہیں۔ مادرِ وطن کے فرزندوں کا افتراق اُنھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ بار بار ملک کو جھنجوڑتے ہیں کہ وطن پر "مصیبت آنے والی ہے"، اور "بربادیوں کے مشورے آسمانوں میں" ہو رہے ہیں۔ جب اس پہ بھی اہلِ وطن کے کان پہ جوں نہیں رینگتی تو آخر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

"نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

لیکن وہ ناامید کبھی نہیں ہوتے، بلکہ "ان بکھرے دانوں کو ایک ہی

تسبیح میں" پرونے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، خواہ یہ مشکل ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ان کی کوشش کارگر نہ ہوئی تو:

"دکھا دونگا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑونگا"

وہ "نقشِ دوئی" مٹا کر "اس دیس میں ایک نیا شوالا" بنانا چاہتے ہیں، جس کا دیوتا خاکِ وطن کا ہر ذرّہ ہوگا۔

غرض کہ اِس زمانے کی یہ بے تابی، سرگرمی اور پریشانی ایک لازمی تمہید تھی بعد میں آنے والی فلسفیت اور سکون کی۔

گو یہ ایک مبتذل تشبیہ ہے، مگر اقبالؔ کے لئے یورپ کا سفر اور تعلیم ایسا ہی تھا جیسا کہ ایک تلوار کا صیقل گر کی دُکان میں پہنچ جانا۔ یورپ نے نہ صرف صیقل کیا بلکہ اقبالؔ کی طبیعت کو مرصّع بھی کر دیا، نہیں بلکہ اُس میں چار چاند بھی لگا دیے۔ ایک لفظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ وہی مقام تھا جس کو اقبالؔ کی فطرت اور طبیعت نے اپنے لئے معراج کا پہلا زینہ بنایا تھا۔ اُن کی نگاہ سطحِ زمین سے اُٹھ کر فضا کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی اور وہ وقت دور نہیں رہا جب وہ یہ کہہ سکے کہ اُن کی "نگاہِ تیز دلِ وجود کو بھی چیر گئی" اور اسی نے وہ کیفیت بھی پیدا کر دی کہ اُن کی "نوائے عشق سے حریمِ ذات میں شور" بپا ہو گیا اور "بت کدۂ صفات میں الامان کے غلغلے" بلند ہو گئے۔ فطرت کا ہر منظر ایک راز کا حامل تھا۔ حُسن و عشق اُن کے لئے خاص کیفیات سے لبریز تھے۔ حسن اور حق متحد ہوئے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ

ہر چیز اُن کے لئے عشق کا پیغمبر بن گئی تھی۔ لیکن عشق محض عشق تک نہیں رُک گیا تھا بلکہ اُسی میں عمل کا سبق بھی موجود تھا۔ "مورِ ناتواں" سے وہ "لطفِ خرام" سیکھتے تھے اور چاند بھی یہی کہتا تھا کہ:

"چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں"

ناکامی اور موت ان کو ہیچ معلوم ہوتی تھی اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ چیزیں عمل کے لئے سدِّ راہ نہیں ہو سکتیں۔

یورپ کی زندگی نے اُنھیں یقین کرا دیا تھا کہ اہلِ یورپ کے 'آزادی، برادری، برابری' اور جمہوریت کے اُونچے اُونچے دعوے سب لغو ہیں اور یورپ کا نظریۂ وطن ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ یورپ مادہ پرستی اور سیاست سے اِس قدر بدظن ہو گئے تھے کہ ایک دفعہ صاف کہہ اُٹھے کہ:

"دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا"

اُنھیں یہ بھی احساس ہوا کہ مشرق اور خصوصاً مسلمان کو اپنی مسلسل نیند سے کروٹ لینے اور بیٹھنے کی ضرورت ہے اِس لئے اُنھوں نے مسلمانوں کی نجات کے لئے ایک لائحۂ عمل مرتب کیا اور اپنی قوم کو دعوت دی کہ:

"شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

انھیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور دنیا کی آئندہ امیدوں کا دار و مدار انھیں پر ہے۔ جس محبت اور دلسوزی کے ساتھ وہ سسلی، ہسپانیہ، بغداد اور دلّی کو یاد کرتے ہیں اور جو محبت اور یاد اُن کے دل میں مسلمانوں کے جاہ و جلال اور علم و ہنر کی تھی اسی نے اُنکی زبان سے بے اختیار یہ کہلوا دیا تھا کہ:

"نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا"

اسلام اور اہل اسلام سے اُنکو جو دلی ہمدردی تھی وہ اُن کے اس پردرد قول سے عیاں ہے کہ:

"غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟"

یہی وہ درد ہے، وہ تڑپ ہے۔ وہ پکار ہے جس نے آج ہم سب کو مجبور کر دیا ہے کہ ہم یہاں جمع ہوں اور اُن کی باتوں پہ کان دھریں اور غور کریں۔ یہی چیز تھی جس نے اقبالؔ کو خالص وطنی ترانوں سے ہٹا کر خالص ملی اور قومی ترانوں پر آمادہ کر دیا تھا، اور اسلام اور مسلم ان کا نصب العین بن گئے تھے۔ ترکی اور بلقان، ترکی اور اٹلی، ترکی اور انگریز، عبدالکریم، رضا شاہ، مصطفےٰ کمال اور امان اللہ، کی طرف ان کی آنکھیں اُٹھتی تھیں۔ پھر جہاں وہ مسلم اقوام میں یہ ہل چل دیکھتے تھے اپنے ہم وطن

مسلمانوں کا ادبار اور جمود ان کو اور بھی تڑپاتا تھا۔ اُن کے کلام کی آخری چیزیں اسی درد، اسی کرب اور اسی تڑپ کا پتہ دیتی ہیں۔ ایک ہی بات کو سیکڑوں طرح کہتے ہیں اور اپنی قوم کو سناتے ہیں۔ لفظ کا لباس نیا ہے مگر ہر قول میں مقصد اور غرض ایک ہی ہے۔ وہ قوم کو توحید، اخوت، عمل، عشق کا سبق دیتا ہے اور سب سے زیادہ اس پہ زور دیتے ہیں کہ ان کی قوم اپنی "خودی" کو صحیح طور پر سمجھ لے اور ایسے اُصولوں پر کاربند ہو جو اُسے ترقی کی معراج کے کمال تک پہنچا دے۔ وہ صبر، توکل، تسلیم رضا، فقر کے پوشیدہ معنی اور غرض کے گورکھ دھندوں کو توڑ کر پھینک دیتے ہیں اور ان کی اصلی غرض و غایت اور اُن کے صحیح استعمال کی طرف قوم کو راغب کرتے ہیں۔ اس میں وہ اپنے ہم وطنوں تک اپنی نگاہ کو محدود نہیں رکھتے بلکہ ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کو بھی نصیحت اور تلقین کرتے ہیں اور اس پہ کامل یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے بتائے ہوئے نسخے اِس دنیا کے پردے پر اُن کی مریض قوم کے لئے ہر جگہ مفید ہونگے اقبالؔ نے جو کچھ کہا اور قوم و مُلک اور دنیا کو سُنایا اُس کا ذریعہ شاعری تھی یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ دنیا کی نگاہ میں شاعر ہیں لیکن جیسا کہ خود اُن کے کئی اقوال سے معلوم ہوتا ہے وہ خود اپنے کو نہ شاعر کہتے تھے اور نہ اپنے کلام کو شاعری سمجھتے تھے۔ حق بھی یہی ہے کہ شعر اُن کے لئے بات کا ایک سانچہ تھا، اظہار خیال کے لئے ایک قالب تھا اور بس۔ اقبالؔ کی حیثیت اُس کے شعر کی شعریت اور شعری کیفیت میں تلاش کرنا غلط ہے

گو اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ کے کلام میں شعر و سخن اپنی خاص حیثیت میں بھی کمال کے معراج کو پہنچ گیا ہے اور اِس میں شبہہ کرنا بھی شعر کی دنیا میں کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ تاہم اقبالؔ کا شعر، اُس کی رائے، اُس کے خیال اور فکر کا حامل ہے۔ اقبالؔ کا فکر انسانیت کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ دین، مذہب، عقیدہ، معاشرت، سیاست سب اس کے اندر گم ہیں۔ اقبالؔ کی سیاسی حیثیت گو بہت بلند نہیں اور وہ اس سبب سے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں اِس شعبے پر کبھی خاص توجہ نہیں کی اور جہاں اُنھیں اپنے کلام سے کبھی نام و نمود اور سستی شہرت مقصود نہیں رہی اسی طرح اُنھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ سیاست میں شریک ہو کر سیاسی مبصّر کی شہرت حاصل کریں۔ تاہم یہ گوشہ گیر اور قناعت پذیر شاعر اپنی عزلت سے نکل کر اپنے صوبے کی قانون ساز مجلس کا رکن بھی ہوا، ایک مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر بھی ہوا، اور دو مرتبہ سات سمندر پار جاکر گول میز کانفرنس میں بھی شریک ہوا۔ اور اِس سب کشش اور کوشش اور دوڑ دھوپ میں بھی شروع سے آخر تک ہمیشہ وہی ایک واحد جذبہ کارفرما رہا کہ جس عنوان سے ممکن ہو، وہ اپنی قوم اور ملّت کی مدد کرے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے جس قدر قابلِ قدر کام کیا اور اپنی قوم کی جو کچھ خدمت کی اس سے سب واقف ہیں اور آج کہ اقبالؔ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں ہم اُن کے اِس قول کو انکسار سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ:-

"اقبالؔ بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا"

اقبالؔ نے خود کہا ہے کہ میں "کل کے شاعر کی نوا ہوں"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ شاعرِ فردا ہی نہیں بلکہ شاعرِ امروز بھی ہے۔ اردو کی قدیم اور فرسودہ شاعری میں غالبؔ نے کچھ جان ڈالدی تھی۔ حالیؔ نے مسلمانوں کو اُن کا ماضی یاد دلا کر تڑپا دیا تھا اور غیرت دلائی تھی۔ اقبالؔ نے استقبال کا رنگ دکھایا ہے اور مسلمانوں کو اُن کے اقبال مند مستقبل کی امید دلائی ہے۔ حق یہ ہے کہ ایک لحاظ سے اقبالؔ اپنے وقت کا مسیح ہے جس کی روح پرور تعلیم نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بالکل صحیح کہا کہ "اقبالؔ کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفے، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک ملٹنؔ کی نسبت یہ کہکر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا، یا کالیداسؔ کی نسبت یہ کہہ کر وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا اس کے اثر کو نہ محدود کیا اور نہ اور مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدر دانی میں کمی کی۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں"

حضرات! کہاں تک آپ کی سمع خراشی کی جائے۔ آخر میں میں

آپ کو سچے دل سے مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی قوم کے ایک ایسے عظیم الشان فرد کی یادگار قائم کی ہے جس کی بدولت نہ صرف یہ کہ ہم اپنے ملک میں ایک خاص انفرادی حیثیت اور شان پہ قابض ہو گئے بلکہ تمام عالم میں ہمارا نام مشہور ہو گیا ہے اور جس کی بدولت مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ اسی شان و شوکت اور اسی عظمت و جبروت کے مالک ہو جائیں گے جو ہماری طبیعت کا تقاضہ ہے، اقبال کی تعلیم کا مقصد ہے، اور اسلام کی تلقین کا صحیح منشا ہے۔ اللہ آپ کی ہمتوں میں برکت دے اور آپ کی قوم کو توفیق دے کہ آپ کی صدا پر لبیک کہیں اور آپ کے اس سرچشمے سے سیراب ہوں۔"

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

جناب محمد مرتضیٰ صاحب صدیقی

انکم ٹیکس آفیسر

"۱۹۳۸ء میں مولوی محمد طاہر فاروقی صدر شعبہ فارسی و اردو آگرہ کالج کی کوششوں سے آگرہ میں "بزم اقبال" قائم ہوئی جس کے سالانہ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں نے فرمائی۔ یہ مقالہ اقبالؒ کی خودی کے تخیل پہ پڑھا گیا اور اس کے بعد فاروقی صاحب کے اصرار پہ نظر ثانی اور کچھ اضافہ بھی کیا گیا۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سادہ انداز بیان میں فلسفۂ خودی سمجھایا جائے اور اقبالؒ کی اردو و فارسی تصانیف سے موقع و محل کے مناسب اشعار دیکر مضمون کو دلچسپ بنایا جائے چند مشکل مقامات میں اقبالؒ کے انگریزی لکچروں کے جملوں کا بہت آزاد ترجمہ مضمون میں شامل ہے اس لئے کہ ان جگہوں پہ ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی قریب قریب انھیں کے الفاظ میں بہتر ہو سکتی تھی مگر اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ موضوع زیر بحث کے بیان کا تسلسل قائم رہے۔"

کشیدی بادہ ہا در صحبت بیگانہ پے در پے
بہ نورِ دیگراں افروختی پیمانہ پے در پے
ز دست ساقیِ خاور دو جامِ ارغواں در کش
کہ از خاکِ تو خیزد نالہ مستانہ پے در پے

اقبالؒ کا درسِ خودی دراصل وہ سبق ہے جس کے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے۔ اس راستہ پہ چلنے والوں نے کہیں تو صرف لا الٰہ کہہ کر سر کٹوایا ہے کہیں انا الحق کہہ کر دار و رسن کا جھگڑا اٹھایا ہے اور کہیں ہمہ اوست میں ایسے گم ہوئے کہ بالکل ہی بھٹک گئے۔ اقبالؒ نے پھر وہی بات اس لئے اٹھائی کہ انسانی عقل کے حدود سے تجاوز نہ کرتے ہوئے حقیقت کو واضح کریں ؎

"مرا معنیٔ تازہ مدعا است
اگر گفتہ را باز گویم رواست"

اور طالبانِ حقیقت کو جو پیغام دیا وہ افراط و تفریط سے بچ کر جادۂ اعتدال پہ چلنے والے کے لئے چراغِ راہ تھا۔

زمن گو صوفیانِ باصفارا خدا جویانِ معنی آشنارا
غلامِ ہمت آں خود پرستم کہ با نورِ خودی بیند خدارا

انھوں نے بتایا کہ کس طرح انا الحق کو سمجھنے والا حق کے آستانے پہ جبہہ سا ہو۔ لا الٰہ کہنے والا اللہ کو پہچانے اور ہمہ اوست میں یقین رکھنے والا اس کو اس طرح سمجھے کہ خود کو بے اختیار سمجھ کر اس میں بے عملی کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ بجائے اس کے وہ اپنی ہستی کی نفی کے ساتھ ساتھ اس کے اثبات پہ اس سے بھی زیادہ یقین رکھے تاکہ راہِ عمل میں سخت کوشش ہو کہ اس تضاد کے امکان ہی میں انسان کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ جہاں اُنھوں نے بتایا کہ:

نفیٔ ہستی ہے کرشمہ اس دلِ آگاہ کا!!
جس کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

وہاں یہ بھی کہہ دیا :-

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود
مکتب و میکدہ جز درس نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود !

مگر انسان اس معمہ کو کیسے سمجھے ۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا اسی کوشش میں ہے کہ اپنی ہستی اور کائنات کا راز معلوم کرے اور یہ جانے کہ دنیا کیا ہے ۔ کیسے بنی ۔ ہم کیا ہیں ۔ کیسے وجود میں آئے ۔ اگر کوئی ان چیزوں کا بنانے والا ہے تو اس کی کیا صفات ہیں اور اپنی ذات کا تعلق اس سے کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے ۔ دنیا اور زندگی کے اس راز کو سمجھنے کی کوشش اتنی عام رہی ہے کہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کے مفکرین نے اس گتھی کے سلجھانے میں اپنی ساری قوت صرف نہ کر دی ہو ، مگر ان سب کوششوں کا یقینی نتیجہ جس کی صحت ثابت بھی کیجا سکے کچھ نہیں نکلا ۔ ہر چیز کی ماہیت کے سمجھنے کا شوق اور اس کے بنانے والے کی ذات اور صفات کی تلاش جاری ہے اور جاری رہے گی ۔ گذشتہ حالات سے اگر آئندہ کے لئے رائے قائم کی جا سکتی ہے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہم کبھی اس راز کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے ۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ انسان جس کو اب سے صرف چند ہزار سال پہلے کے تاریخی واقعات معلوم ہیں ۔ جس کے مختلف علوم کے اصولوں میں اس لئے برابر تبدیلی ہوا کرتی ہے کہ ایک تجربہ تجربات ماقبل کے نتائج کو غلط ثابت کرتا ہے ۔ جو باوجود اپنی تمام

ترقیوں کے واقعتاً فطرت کے ہاتھ میں ایک آلہ کار ہے۔ یہ پتہ لگانا چاہتا ہے کہ کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اور سچ پوچھیے تو ابتدا سے زیادہ اہم سوال ہر ایک کے لئے اُس کی انتہا کا ہے ؎

از سر انچہ بود و رفت در گذر انتہا طلب
پیش نگر کہ زندگی راہ بہ عالمے برد

بہرحال چونکہ انسان ہر چیز کو سمجھنا چاہتا ہے اس لئے اس نے اپنے دماغ کی کاوش سے دنیا کی ابتدا کو سمجھنے کے لئے، جو صورتیں مختلف وقتوں میں اختیار کی ہیں ان میں سے چند یہ تھیں۔ کسی نے کہا "پہلے عدم تھا پھر ہیولیٰ پیدا ہوا اور پھر اس سے کائنات کی اور چیزیں بنیں"۔ بعض نے کہا "مادہ ہمیشہ سے موجود تھا اور ایک ازلی طاقت کی وجہ سے اس میں ہیجان پیدا ہوا جس سے جمادات، نباتات اور پھر اور ذی حیات چیزیں بنیں"۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ "ہمیشہ ہمیشہ سے ایک لطیف ہستی تھی، اس نے اپنی صفات کو دیکھنا چاہا، یہ خواہش اس کی محض لطافت سے علیحدہ ایک شے تھی جس کی وجہ سے لطافت میں کمی ہوئی اور درجہ بدرجہ سارا عالم کائنات وجود میں آیا"۔ کچھ کہتے ہیں کہ "مادہ کا وجود نہیں بلکہ ازلی روح انسانی روح پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے تمام مشاہدات ہوتے ہیں جنکی وقعت خواب میں نظر آنیوالی چیزوں سے زیادہ نہیں" ؎

ہر کس نگہے دارد ہر کس سخنے دارد
در بزم تو می خیزد افسانہ ز افسانہ

ان تمام اقوال پہ غور کیجیے۔ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف طریقوں سے ایک ایسی بات پہ اظہار خیال ہے جس کے لئے اگر کسی حد تک ثبوت ہے بھی تو ایک درجہ ایسا آتا ہے جس کے آگے کوئی نہ کوئی بات بغیر ثبوت کے ماننی پڑتی ہے مادّہ کا تذکرہ کرنے والے اس کی ماہیت سے ناواقف ہیں اور جب تجربات ہوتے ہوتے مادّہ ٹوٹ کر جوہر بنتا ہے، تو انسانی علم کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں لطیف شے کو کثافت کا درجہ دینے دینے کائنات بنا دینے والے اس فرض کئے ہوئے تدریجی تنزّل کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور انسان کا ذہن اس سے خالی ہے کہ یہ مدارج کیسے پیدا ہوتے ہیں اور جو لوگ ازلی روح کے انسانی روح پر پرتو ڈالنے کے قائل ہیں وہ روح کے متعلق کوئی ایسا نظریہ نہیں رکھتے جو ادراک میں آسکے۔ ان سب بیانات میں کم و بیش "قیاسات" کو دخل ہے اور "قیاسات" کی صحت یا عدم صحت پر بحث بیکار ہے۔ ع

"راہ بر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات"

زندگی، قوت نشود نما، روح کچھ کہہ لیجیے، انسان کے عملی تجربات ابتک نہ تو یہ بتا سکے کہ اس سے اجسام کا کس طرح تعلق ہے یعنی یہ قوت جسم پہ کس طرح اثر ڈالتی ہے، نہ قطعی طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ آیا روح اپنے اندر کوئی ایسی تخلیقی قوت رکھتی ہے جس سے بطور خود جوہر یا مادّہ کی صورت پیدا کر سکے اور جب تک یہ باتیں دریافت نہ ہو سکیں گی یہ راز رازہی رہیگا صرف ایک بات کے سب قائل ہیں کہ کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی ہستی ایسی ہے جس کی وجہ سے ہمارا وجود ہے اور زندگی کے یہ تمام کرشمے نظر

آتے ہیں اور اسی ہستی کی معرفت حاصل کرنے میں سب کوشاں ہیں۔

به بلند و پست عالم تپشِ حیات پیدا
چه دمن چه تل چه صحرا رمِ ایں غزاله دیدم
نه به ماست زندگانی نه زِ ماست زندگانی
همه جاست زندگانی زِ کجاست زندگانی

ابتدائے عالم یا کائنات کو وجود میں لانے والی ہستی کے متعلق اگر قطعی ثبوت بہم پہنچانا ممکن ہوتا تو یہ سب جھگڑے ہی نہ ہوتے۔ شاید عام انسانی دماغ خود اجسام کی دنیا میں پابند ہونے کے باعث اس ازلی[1] تخلیقی حرکت کو نہیں سمجھ سکتا جس کی وجہ سے یہ عالم ہماری نظروں کے سامنے ہے اور اس کی تلاش کے تشنہ رہنے کی بھی شاید یہی وجہ ہو۔

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

جہاں فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اپنے اپنے حدود کے اندر رہ کر حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی وہاں اقبالؒ نے اب تک کے تجربات سے جو علم حاصل ہو چکا ہے، سائنس کے وضع کیے ہوئے اصول جو ایک حد تک یقینی سمجھے جاتے ہیں، اور تخیلی فلسفہ کے مسائل ان سب کو

[1] ازلی کا مفہوم ہمیشہ رہنے والی سمجھا جائے نہ کہ وہ تخلیقی حرکت جس کی ابتدا ایک خاص وقت میں ہوئی اور ختم ہو گئی۔

پیش نظر رکھ کر اصل حقیقت کو آشکارا کرنا چاہا ہے۔ حقیقت کو سمجھنے میں ان علوم سے مدد لینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک اور بھی وسیلہ بتایا ہے جو انھیں کے الفاظ میں صاحب نظر سے حاصل کی ہوئی دانش نورانی ہے۔ حسب حال کہتے ہیں ؎

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

اقبالؒ کے نزدیک جہاں اور علوم، حقیقت کے ایک ایک جزو کو علٰحدہ علٰحدہ سمجھنا اپنا معیار قرار دیتے ہیں رشد و ہدایت کی ازلی کتاب سے حاصل کی ہوئی "دانش نورانی" کل کائنات روحانی و جسمانی کی طرف توجہ کرتی ہے اور اس پر تصرف کے طریقے بتاتی ہے۔ اس دانش کی روشنی میں تمام علوم سائنس و فلسفہ پر جِلا ہو کر ان میں رازِ ہستی کے آئینہ دار بننے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بروئے عقل و دل بکشائے ہر در
بگیر از پیر ہر میخانہ ساغر
دراں کوش از نیاز سینہ پرور
کہ دامن پاک داری آستیں تر

سوال یہ ہے کہ انسان غور و فکر اور تجربات کے کن درجوں سے اصل حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس کے مشاہدات و احساسات کیا ہیں اور ان سے وہ کیا نتائج کس طرح نکالتا ہے۔ اقبالؒ کے

نزدیک حقیقت تک جلد تر پہونچنے کی راہ اپنی ہستی پر غور و تدبر اور اپنے واردات قلبی پر تفکر ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اور ذرائع یعنی اپنے قوائے حسیہ کی مدد سے حقیقت کو تلاش کرنے کے قائل نہیں۔

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

فطرت کو سمجھنے کی کوشش تلاشِ حقیقت کا ضروری جزو ہے مگر جیسا ابھی کہا جا چکا ہے ان دونوں طریقوں میں فرق ہے۔ اور ویسا ہی اُن کے نتائج میں بھی۔

عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کیلئے

آیئے شاہراہ حقیقت کے سب سے نمایاں نشانِ منزل کی طرف چلئے اور اقبالؒ کے ساتھ۔

نظر بہ خویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

کے مصداق بن کر اپنی ہستی کے متعلق غور کیجئے۔ اپنی ہستی کے اثبات کے لئے سب سے اطمینان بخش دلیل کسی انسان کا یہ یقین ہے کہ وہ موجود ہے۔

من از بود و نبودِ خود خموشم ✣ اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادۂ کیست ✣ کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

انسانی ہستی کی یہ موجودگی اس کی مکمل جسمانی حیثیت ہی کا نام نہیں ہے اسلئے کہ کسی جسمانی حصہ میں اصل ہستی کو مقید نہیں سمجھا جا سکتا ؎

بہ تن جاں آنچناں دارد نشیمن
کہ نتواں گفت اینجا نیست آنجاست

ہماری ہستی بالذات قائم ہے اور جسم میں ہونے کے باوجود اس کے مکانی حدود متعین نہیں کئے جا سکتے یا یوں کہہ لیجئے کہ میں غور و فکر کرتا ہوں اور میرے تخیلات کو عملی صورت دینے کی طاقت میری فطرت میں ہے اس لئے میری ہستی کا وجود ہے۔ جو درجہ فلسفہ میں تفکر، تخیل اور عمل کا ہے وہ ایک اعتبار سے دنیائے راز و نیاز میں عشق کا ہے اور انھیں ہم معنی الفاظ سمجھ کر اقبالؒ کی زبان سے یہی بات سنئے ؎

در بود و نبود من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

خدا کو ہم ان مادی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے اس لئے ہم اس کے وجود کے منکر ہو سکتے ہیں مگر غور کرنے والے کے لئے اپنے وجود سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔

شاخ نہالِ سید راہ خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو

دوسری خصوصیت اس ہستی کی یہ ہے کہ کم و بیش ہر صورت میں یہ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور اکثر واقعات میں یا خاص

حالات کے ماتحت انسان میں اضطراری طور پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جسے اور کوئی بہتر طریقہ اظہار نہ ہونے کی صورت میں کیفیت دعائیہ کہہ لیجئے۔ اس کیفیت میں عجز و نیاز، رقت و زاری، طلب و التجا، اور سوز و گداز کی کیفیتیں شامل ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ماکف خاکیم
بہ ذرہ ذرہ ما درد جستجو ز کجاست

ماہرین علم النفس کا خیال ہے کہ یہ کیفیت انسان میں ہمیشہ رہی ہے گو ذاتی حیثیت سے اس کے احساس کے مدارج مختلف رہتے ہوں۔ یہ کیفیت دراصل اپنی خود اختیاری کے یقین کے ساتھ اپنی بیچارگی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کیفیت کائنات کی تنہائی میں جہاں کا ہر ذرہ بیگانہ نظر آتا ہے انسان کے اپنی جگہ پانے اور اپنے وجود کا مقصد معلوم کرنے کی خواہش کا نتیجہ بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس تلاش و تفحص، سوز و گداز یا کیفیت دعائیہ کو بعض مفکرین انسان کے ایام جاہلیت کا وہ خاصہ سمجھتے ہیں جس کو اب تک مٹایا نہیں جا سکا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کیفیت ہماری ہستی میں اس لئے ودیعت کی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ ہم آنکھ بند کئے ہوئے معمورۂ عالم میں نہ رہیں بلکہ حیات کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کیفیت کا سبب دریافت کرنے کے لئے ہمیں اپنے دل کی کیفیتوں ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اکثر حالات میں یہ باطنی کیفیت خارجی احوال سے علاقہ نہیں رکھتی ؎

نشانِ راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہماری ہستی ہمہ وقت کسی نہ کسی مقصد کے حصول میں مشغول رہتی ہے۔ خواہ وہ عملی حیثیت سے ہو یا آئندہ عمل کے لئے فی الحال تخیلی حیثیت سے۔ اگر حصولِ مقصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہے یا ناکامی سے سابقہ پڑتا ہے تو اس کا خاصہ ہے کہ بیرونی دنیا سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی دنیا بنا لیتی ہے۔ اِس اندرونی[1] تخیلی زندگی میں ناکامی کا احساس کم ہو کر اسے تسکین کا سامان بہم پہونچتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ نئی راہ عمل کی تشکیل ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ سلسلۂ فکر و عمل برابر جاری رہتا ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہمارا تخیل و تفکر محدود نہیں ہے۔ قوت مفکرہ صرف اس اعتبار سے محدود کہی جا سکتی ہے کہ تلاش علم میں اسکو ایک وقت میں ایک خاص ماحول کے متعلق غور کرنا پڑتا ہے۔ مگر واقعۃً تفکر اسی ماحول تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ غور کرنے کے دوران ہی میں اپنی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ غور و فکر اور عمل کے ذریعہ سے زندگی میں مستقل حصہ لیتے رہنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ قوت مفکرہ اپنے محدود دائرہ سے گذر کر لاانتہا تخیلی اور ارادی وسعتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور یہ نظریہ کہ "لاانتہا" کا تخیل انسانی ذہن نہیں کر سکتا

---

[1] اندرونی امکانی اعتبار سے نہ کہ بیرونی مکانی حیثیت سے کیونکہ اس آخری صورت میں غالباً "لاانتہا" کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

صحیح نہیں۔ جب ہم زمانے کے دور و تسلسل پہ غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وقت گذرنے کے باوجود ہماری ہستی اپنی اندرونی زندگی میں یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ہستی کے احساسات بدلتے رہنے کی صورت میں جو انقلاب ہوتا ہے اس کے واسطہ سے ہماری ہستی کی موجودگی ماضی، حال اور مستقبل نہیں بن جاتی بلکہ باوجود وقت گذرتے رہنے کے اپنی جگہ مستقل قائم رہتی ہے ؎

در جہانِ دل ما دور و قمر پیدا نیست
انقلابیست و لے شام و سحر پیدا نیست

ایک طریقہ اس کے اظہار کا یہ بھی ہے کہ اپنی ہستی کے واسطہ سے خود زمانہ کی نوعیت دو قسم کی سمجھی جائے۔ اصل زمانہ تو وہ ہے جسمیں ہستی بغیر تبدیلی کے موجود رہتی ہے اور یہی ہستی جب بیرونی اشیاء کی طرف توجہ کرتی ہے اور ان سے ربط قائم کرتی ہے تو اسکا دوسرا رخ نمایاں ہوتا ہے۔ اور اس کے واسطہ سے "زمانہ" کی نوعیت بدل جاتی ہے ؎

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اِک جہاں اور بھی ہے جسمیں نہ فردا ہے نہ دوش

بیرونی حوادث کے سمجھنے اور برتنے کے لئے ہماری ہستی اصل "زمانہ" کے ٹکڑے کرکے ماضی اور مستقبل کا تخیل قائم کرتی ہے۔ اس کے سمجھانے کے لئے اقبالؒ نے یہ مثال دی ہے کہ سائنس کی رو سے سرخ رنگ کے نظر آنے کا سبب فضا میں ایک سکنڈ میں چالیس کروڑ مرتبہ کا ارتعاش ہے۔ اگر اس

ارتعاش کو دہزار فی سکنڈ کے حساب سے گنا جائے جس سے زیادہ شمار کرنا اب تک ممکن نہیں ہو سکا ہے تو صرف اس کے گننے میں چھ ہزار سال سے زیادہ لگیں گے مگر ہمارا ذہن اس ارتعاش کے سلسلہ کو جسکا شمار تک ممکن نہیں ایک لمحہ سے بھی کم میں محسوس کر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہماری ہستی اس تمام سلسلۂ حوادث اور اس سے پیدا شدہ تمام احساسات و کیفیات کو یکجائی صورت میں جذب کر کے ایک مستقل موجودگی کی صورت دیتی ہے۔ اور ہستی کا اصل زمانہ ان مختلف حوادث کے زمانہ سے کچھ ایسا ہی علاقہ رکھتا ہے جیسا چالیس کروڑ مرتبہ ارتعاش کا یکے بعد دیگرے ہونا۔ اس ذرا سے وقفہ سے جس میں یہ تمام سلسلہ بہ یک وقت محسوس کیا جا سکتا ہے۔

خرد در لامکاں طرح مکاں بست!
چو زنارے زماں را بر میاں بست!
زماں را در ضمیر خود ندیدیم!
مہ و سال و شب و روز آفریدیم!

ہم نے قید مکانی کے بغیر ایک ہستی کا قیام چند واردات قلبی کی وجہ سے تلاش حقیقت، تخیل و تفکر کا لاانتہا ہونا اور زندگی کا ایک مستقل عملی حیثیت رکھنا اپنی ہستی کے خصوصیات میں پایا اور اس نتیجہ پر بھی پہونچے کہ اصل زمانہ ہمارے عام طور سے سمجھے ہوئے زمانے یعنی محض شام و سحر کے تسلسل سے مختلف ہے۔ اب تھوڑی دیر کے لئے عالم موجودات کی اشیاء کی طرف متوجہ ہو کر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہم ان کے مطالعہ سے کیا سیکھتے ہیں۔

عالم کائنات کی مادی حیثیت کے متعلق موجودہ سائنس کی متابعت کرتے ہوئے اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ احساسات کا باعث مادّہ نہیں بلکہ ایک قسم کا ارتعاش ہے جس سے اثر پذیر ہو کر ذہن کسی شئے کو محسوس کرتا ہے۔

جہان رنگ و بو گلدستۂ ما ‏ ‏ ‏ زما آزاد و ہم وابستۂ ما
گر اور اکس نہ بیند زار گردد ‏ ‏ ‏ اگر بیند یم و کہسار گردد
زدانش در حضور ما بنودن ‏ ‏ ‏ منور از شعور ما بنودن
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست ‏ ‏ ‏ کہ بے او جلوۂ نور و صدا نیست

اس صورت میں اگر کائنات کو صحیح طور سے سمجھنا ہے تو اشیاء کا مادّی تصوّر ذہن سے نکال کر کائنات کو ایک مستقل حرکت سمجھنا چاہئے اور اشیاء کو دراصل وہ حوادث فطرت جو ذہن کے واسطہ سے موجودہ صورت پاتے ہیں۔ چونکہ فی الحال ہمارے ذہن کی ساخت اس طرح پر ہے کہ وہ حرکت کو مختلف نقطوں پر ساکن سمجھنے کے بغیر اس کا تصور نہیں کر سکتا اس لئے ہر سلسلۂ حرکت و ارتعاش کو ساکن یا مقابلۃً متحرک سمجھکر ہم مادی اشیاء کا تخیل قائم کر لیتے ہیں۔ حوادث فطرت یا سلسلۂ حرکات کے یکے بعد دیگرے ہونے سے جو رشتہ باہم ان میں قائم ہوتا ہے اس کو اپنے محدود ذہنی قویٰ سے قبول کرنے سے مکانی حیثیت پیدا ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کا معلوم کرنا ناممکن ہے کہ وہ حرکت جس کے اثر سے ذہن یہ صنم خانہ بناتا ہے کہاں سے آتی ہے۔ روحِ کائنات جس کا نہ تو مشاہدہ ہو سکتا ہے نہ اس پہ تجربے ہو سکتے ہیں اور نہ قوائے حسیہ

کی مدد سے اس کی ماہیت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کی اصلیت کا کیا راز ہے۔

اے من از فیض تو پائندہ نشانِ تو کجاست
ایں دو گیتی اثرِ ماست جہانِ تو کجاست

مادّی اشیاء کے اس تذکرہ کے بعد عام حیات یا زندگانی کے متعلق غور کرنا چاہیئے یہ ایک تو نباتات کی بالیدگی اور قوت نمو ہے اور دوسری وہ زندگی ہے جو قوت نشوونما کے علاوہ عام حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ نباتات میں زندگی اور قوت نشوونما کیسے آتی ہے اس کا مشاہدہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہمارا علم محدود ہے۔ روشنی، پانی، مٹی اور ہوا کے اثرات تو ظاہر ہوتے ہیں مگر ان کے قوت نشوونما میں تبدیل ہو جانے کا راز سائنس کے تجربات سے نہیں کھلتا۔ اور نہ اس کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ:۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لاتا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

باوجود اپنی بے نظیر ترقیوں کے ہمارے تمام علوم "نمایم انچہ ہست اندر رگِ گل" کے دعویدار نہیں ہو سکے۔ نباتات سے گذر کر اور جاندار چیزوں میں قوت نشوونما کے علاوہ زندگی کی اور نشانیاں بھی ملتی ہیں یعنی ان کا چلنا پھرنا اور ذی ارادہ ہونا۔ دراصل ان سب کی حیات ایک قوت عمل ہے جو اپنے ماحول سے ایک خاص رشتہ میں منسلک ہو کر مختلف صورتوں

کارفرما رہتی ہے۔ کسی شے میں زندگی کا احساس اس شے کی "اصل زندگی" سے علٰحدگی کا مترادف ہے۔ اس علٰحدگی کے احساس ہی کی وجہ سے ہر ذی حیات شے اپنے محدود دائرے میں زندگی کے کارناموں کو آگے بڑھاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب بھی شافی نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک علوم طبیعی کے میکانکی اصولوں سے آگے بڑھکر کوئی روحانی واسطہ نہ قائم کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے کرشموں میں باوجود گوناگوں اختلافات کے یہ یکرنگی اور یکسانیت ہے کہ احساس حیات پاکر ہر شے کی ساری زندگی اپنے کردار کے محور پر گھومتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان تمام ذی حیات اشیاء کا ایک خاص نوعیت سے کام کرتے رہنا بغیر کسی مقصد کے نہیں ہو سکتا۔ اور پھر مقصد کا تخیل اور شعوری عمل کی توضیح مادی اور میکانکی اصول پہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہر ذی حیات شے زندگی کے ایک ایسے چشمہ سے فیضیاب ہے جو ابتدا سے اسمیں کسی مقصد کا کم و بیش احساس پیدا کرتا آیا ہے۔

مشاہدات سے حاصل کیا ہوا تجربہ ہمارے سامنے اصل حقیقت کو ایک لازوال حیات کی کیفیت میں اور مادی اشیاء کو ایک سلسلہ حرکت دار تعاش کی صورت میں پیش کرتا ہے اور خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ذہن انسانی کائنات کا تخیل بغیر کسی ایسی شعوری ہستی کے جس میں زندگی کی یہ تمام مختلف النوع کیفیات یکجا سمجھی جا سکیں نہیں کر سکتا۔ ؎

ساقیا تنگ دل از شورشِ مستاں نہ شوی
خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست!
بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شد زنخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزار چہ ہست!

ہماری ساری ذہنی اور فکری قوتیں، ہمارا سارا فلسفیانہ استدلال، ہماری سائنس کے سارے تجربات اور ہمارے دل کی ساری بیچینی اور اضطراب کسی بہار بے خزاں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جہاں ہمارے تمام علوم اس حیات ازلی کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں وہاں سب سے یقینی طور سے اس پر ایمان لانے کے لئے انسان میں وہ دانش نورانی بھی موجود ہے جس کے سامنے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں جس کا ہستی مطلق پر غور کرنے کے دوران میں یہ احساس کہ ایک ذات موجود ہے جو اس ساری تغیر پذیر دنیا میں اصل ہستی ہے ان تمام اور وجوہ پر جو اس ہستی کو ثابت کرنے کی کوشش کریں بھاری ہے۔ ؎

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد
بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

مگر انسان اپنے بیرونی تعلقات میں اس درجہ کھویا رہتا ہے کہ وہ بہت کم اس کے متعلق غور کرتا ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو ایمان اور یقین کا انتہائی درجہ میسر آتا ہو ہاں کبھی کبھی انسان کو اپنے دل کی دنیا میں ڈوب جانے کی حالت میں تھوڑی دیر کے لئے اصل حقیقت کا

احساس ہو جاتا ہے مگر پھر بہت جلد اس کی چشم حقیقت بیں پہ ایک پردہ سا پڑ جاتا ہے۔

زمانے گم کنم خود را زمانے گم کنم او را
زمانے ہر دو را یابم چہ رازست ایں چہ رازست ایں

بہرصورت "دانش نورانی" اور "دانش برہانی" دونوں کے وسیلے سے ہمیں خدا کی ہستی کا سراغ ملتا ہے۔ اور اپنے تجربات اور احساسات اور اپنے غور و فکر سے بھی ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ سارا کارخانہ خدا کے تخلیقی افعال ہیں اور اس کی ہستی سے باہر یا اس کے علاوہ انکا وجود نہیں ہے۔ نیرنگیٔ کائنات اُسی ہستی کے تخیل و عمل کی نیرنگی ہے جس کے تخلیقی ارادہ سے اشیاء ظہور پذیر ہوتی ہیں ؎

پرتوِ حسنِ تو می اُفتد بروں مانند رنگ
صورتِ بے پردہ از دیوارِ مینا ساختی

ہمارے ذہن میں اس ہستی کے لامکاں ہونے کا خیال آسکتا ہے اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی ہستی کی موجودگی کے لئے اس کا مکانی تعین ضروری نہیں۔ ع

درون خوں نگر ایں نکتہ پیداست

اس ہستی مطلق کی موجودگی کا "زمانہ" ہمارے ذہن میں نہ آسکے مگر ہمیں "زمانہ" کی نوعیت پر غور کرنے سے اس کا اشارہ مل چکا ہے کہ ہزار ہا سال کی مدت اصل زمانہ کی ایک آن سے بھی کم ہے۔ ہم یہ بھی سمجھنے کی

کوشش کر سکتے ہیں کہ جب ہماری ہستی اپنے کیفیات، احساسات، مقاصد اور افعال کے لاتعداد ہونے پر بھی خود نہیں بدلتی تو کثرت میں وحدت کا امکان کس طرح ہے اور کس طرح ان تمام گوناگوں مظاہر کے باوجود جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں اس ہستی کی یکتائی میں کوئی فرق نہیں آتا ؎

اسرار ازل جوئی بر خود نظرے واکن !
یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی
عشق است و ہزار افسوں حسن است و ہزار آئیں
لے من بہ شمار آیم لے تو بہ شمار آئی

یہاں ایک بات اور صاف کر دینی ضروری ہے ۔ اقبالؒ کے نزدیک ساری کائنات کے مجموعہ ہی کا نام خدا نہیں ہے ۔ قرآن مجید میں خدا کی مثال نور سے دی گئی ہے اور اقبالؒ نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ چونکہ ہمارے سارے تجربات کے دائرہ میں روشنی ہی ایک ایسی شے ہے جو دیکھنے والے کے واسطہ سے تبدیل نہیں ہوتی اس لئے اس مثال سے خدا کے وجود کے مطلق ہونے کو بتانا مقصود تھا اور اس کے ساری کائنات میں جاری و ساری ہونے کو اس طرح سمجھانا جس سے یہ ذہن میں نہ آئے کہ خدا محض کسی عنصر کی طرح ساری کائنات میں محیط ہے اور یہی اس کی ہستی ہے ۔ نور کی مثال کے بعد طاق، چراغ اور قندیل کی تفصیلی کیفیت ذہن کو اسی تخیل سے ہٹانے کے لئے ہے کہ خدا کسی عنصر

کی طرح کائنات میں محیط سمجھا جائے۔ جس طرح کسی خاص فعل کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فاعل کی مکمل ہستی ہے اسی طرح کائنات کو جو خدا کے تخلیقی افعال کا سلسلہ ہے خدا کی مکمل ہستی سمجھنا صحیح نہیں۔ خدا کی تخلیقی قوت برابر مصروف عمل ہے۔" اور خدا اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے"۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ہستی مطلق کی مکمل صفات کا تخیل اور ان کا تفصیلی بیان ناممکن ہونے کی وجہ سے مجبوراً ہمیں اس کی صفتیں اپنے محدود طریقہ اظہار سے کرنی پڑتی ہیں اور اقبالؒ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی اپنے صرف ایک حد تک ہی سمجھنے کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

حدِّ حسنِ تو بہ ادراک نہ شاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من است

حیات کے مختلف طریق اظہار میں جو نقطہ ہستی کا احساس رکھنے کے اعتبار سے جس حد تک روشن ہے اسی حد تک اس دنیائے اعتبار میں اس کی قدر و قیمت کا پلہ وزنی ہے۔ انسانی ہستی میں یہ احساس اور اس کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہونے کی بجائے خود ان پہ اپنا اثر ڈالنے کا یقین، یہی اس کا احساس خودی ہے۔ انسان کی خود شناسی، اس کا لا انتہا تخیل، اس کی ارادی

قوتین اور اس کی زندگی کے مقاصد کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنے شعور و آگہی اور قوت عمل کی وجہ سے اس کا درجہ کائنات میں افضل ترین ہے اور انسانوں میں بھی جس انسان کو اپنے اس شرف کا جتنا زیادہ احساس ہے اور اس اعتبار سے اس کے افکار و اعمال جس نوعیت کے ہیں اتنا ہی وہ اوروں پر تفوق رکھتا ہے۔ دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کی بابت اس کا فکر کرتے رہنا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرگرم رہنا اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ وہ مخلوق میں بہتر درجہ پر فائز ہے۔ اور اس ذمہ داری کا بوجھ کامیابی سے اٹھانا اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا معیار ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

گذشتہ بیان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبالؒ کی تعلیم:-

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

کا کیا مطلب تھا۔ اقبالؒ نے اس ہستی کے متعلق جس کی قدرت کاملہ کا شاہد کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہے سارے غور و فکر کے نتیجہ کو بہت مختصر اور جامع طور سے بیان کیا ہے کہتے ہیں ؎

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

انسان کا ایک لازوال ہستی کے جزو ہونے کے نازک مسئلہ کو کسی حد تک سمجھ لینے کے بعد انسان کی عملی حیثیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ انسان میں عموماً خودی کا احساس اس حد تک نہ ہو سکنے کے کہ اس کی قوت عمل کو تازیانہ ہو کئی وجوہ ہیں۔ عالم فطرت کے مطالعہ اور اپنی ہستی پر غور کرنے سے انسان کی سمجھ میں یہ تو آجاتا ہے کہ یہ سارا کارخانہ کسی کامل ہستی کا بنایا ہوا ہے مگر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ واقعات دنیا مصیبت و تکلیف اور رنج و ناکامی کا ایک سلسلہ ہیں تو اس کی قوت عمل میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور بجائے سرگرم عمل ہونے کے وہ سوچنے لگتا ہے کہ ایسی دنیا میں کسی کوشش اور عمل کا نتیجہ ہی کیا ہے جہاں زیادہ تر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور جہاں رنج و غم کے مقابلہ میں اگر کہیں مسرت و انبساط ہے بھی تو بہت عارضی طور سے ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ذات مطلق کی خودی کا اظہار انفرادی ہستیوں کی تخلیق میں ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک اس کی خودی کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی خودی خود رکھتی ہے۔ اپنے استحکام و بقا کے لئے ان ہستیوں کی آپس کی جد و جہد کا نتیجہ بہتوں کا مٹنا اور کچھ کا ابھرنا ہوتا ہے چونکہ انسان میں اپنی شعوری حیثیت کی وجہ سے اس تنازع اور اس کے نتائج کا احساس بہت قوی ہے اسی لئے یہ دنیا اس کو ایک مستقل غم خانہ نظر آتی ہے۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او
غیر او پیداست از اثبات او
در جہاں تخم خصومت کاشت است
خویشتن را غیر خود پنداشت است
ساز و از خود پیکر اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را
بہر یک گل خون صد گلشن کند
وز پے یک نغمہ صد شیون کند

لازوال خودی کے مستقل عملی اور تخلیقی صفات کے ظہور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی اشیاء میں برابر تبدیلی اور ترقی ہوتی رہے۔ ہمیں اسکے تاریک پہلو پر زیادہ غور کرنے کی بجائے یہ سمجھنا چاہیے کہ برابر تبدیلی ہوتے رہنے کی وجہ سے یہ دنیا انسان کی حیات شعوری کے ارتقاء کے لئے ایک تربیت گاہ ہے۔ اور جس طرح کسی مکتب میں استاد کی تنبیہہ سے بچوں کے ذہنی نشوونما میں مدد ملتی ہے اسی طرح کائنات کے حوادث اور یہاں کے رنج و غم کا احساس انسان کی روحانی تربیت کا ذریعہ ہے۔ یہ امر واقع ہے کہ ناسازگار حالات میں ناکامی اور نامرادی سے سابقہ پڑ کر انسان میں ہر قسم کی صورت حال کو برتنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور مصیبت میں انسان کی نظر کچھ عرصہ کے لئے بیرونی تعلقات سے ہٹ کر حقیقت کی متلاشی ہوتی ہے۔

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

دوسری وجہ اور بھی ہے، انسان جو اصل زمانہ کے ایک آن میں اور ہمارے شمار کے مطابق ہزاروں لاکھوں برس میں تہذیب و تمدن کے اس درجہ تک پہنچا ہے اوّل اوّل فطرت کے سامنے بے بس تھا اور اس کی نظر عموماً حوادث کے ان پہلوؤں پر پڑتی تھی جن میں اس کی بیچارگی زیادہ نمایاں تھی اسی لئے رنج و غم کو ہر حادثہ میں دیکھنا اس کی فطرت کا خاصّہ بن گیا۔ اس کی اس ذہنیت میں تبدیلی رونما ہونا اور غم کے بادلوں میں امید کی شعاعوں کا چمکنا مشکل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ حوادث سے ٹکرا کر پیچھے نہ ہٹے بلکہ ان کا استقامت سے مقابلہ کرکے میدانِ عمل میں آگے بڑھتا جائے اور ناکامی کی صورت میں بجائے ناامیدی کے اس میں نئی ہمت اور عزم و استقلال پیدا ہو۔

درماں ز درد سازاگر خستہ تن شوی
خوگر ز خار شو کہ سراپا چمن شوی

ایک اور درجہ بھی ہے اور وہ یہ عام یقین ہے کہ ہر آئندہ واقعہ خدا کے

علم میں ہے۔ اس خیال کا نتیجہ ظاہر ہے کہ "جب ہر وہ بات جو ہونے والی ہے پہلے سے مقدر ہے تو پھر ہماری کوششیں بالکل بیکار ہیں"۔ اقبالؒ نے سمجھایا ہے کہ اول تو ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہمارے "علم" اور خدا کے "علم" میں یہ فرق ہے کہ خدا کے لئے "علم" ہمیشہ اس شے کا ہوتا ہے جس کا وہ خود خالق ہے۔ اور ہمیں علم کی کسی ایسی قسم کا تجربہ نہیں۔ اوّل تو جو چیز اور واقعہ اب تک معرضِ وجود میں نہیں آیا اس کے علم کا کوئی سوال ہی نہیں اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر آئندہ واقعہ اس طرح خدا کے علم میں ہے کہ وہ مقدر ہو چکا اور اٹل ہے تو ایک تو مشاہدات کے خلاف خود ذاتِ مطلق کا اختیار محدود ہو کر رہ جائے گا یا صرف امکانی حیثیت سے باقی رہے گا۔ اور دوسرے ہر ذی اختیار ہستی بالکل مجبور سمجھی جائے گی جو صحیح نہیں ہے۔

تو ہر مخلوق را مجبور گوئی
اسیر بند نزد دور گوئی

ولے جاں از دمِ جاں آفرین است
بچندیں جلوہ ہا خلوت نشین است

ز جبر و حدیثے درمیاں نیست
کہ جاں بی فطرت آزاد جاں نیست

شبیخوں بر جہان کیف و کم زد
ز مجبوری بہ مختاری قدم زد

اقبالؒ کا یہ خیال ہے کہ خدا جو کچھ کرنے والا ہے وہ اس کے علم میں ہے مگر اس طرح جیسے ہم اگر کسی کام کو کرنا چاہیں تو اس کے پورا کرنے کی تمام جزئیات ہمارے ذہن میں ہوں ؎

گماں مبر کہ سر شتند در ازل گل را
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیر وجود

خدا کے علم و ارادہ میں کائنات کی تخلیق کا مقصد اور اس کا علم اس طرح سمجھنے میں خدا کے خلق و امر کی صفات کے اظہار کا موقع باقی رہتا ہے اور قضاء و قدر کی اس تاویل میں عمل کی قوت رکھنے والی ہستیوں کو جو اختیار خدا نے اپنی قدرت سے عطا کیا ہے وہ بھی سلب نہیں ہونے پاتا۔ انسان بحیثیت ایک ذی اختیار ہستی کے جمادات و نباتات کی طرح تقدیر کا پابند نہیں ہے۔ اس کے لئے راہ عمل کھلی ہوئی ہے اور وہ اپنی تقدیر خود آپ بناتا ہے۔ اگر برے راستہ پر چلتا ہے تو یہ اس کی نکبت ہے اور اگر فطرت کے قوانین کے مطابق عمل کرتا ہے تو یہ اس کی بہتری اور اس کی تخلیق کے مقصد کو پورا کرنیکا ذریعہ ہے۔

اقبالؒ خدا کی عطا کی ہوئی آزادی اور انسان کے اختیار عمل پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
عزیب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

انسان کو راہ عمل میں سرگرمی سے باز رکھنے کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس ذات مطلق پر ایمان لانے کے بعد جو یکتا ہے، جو تبدیل نہیں ہوتی،

جو علیم ہے، جو مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے، جو سب اشیاء کی تخلیق کا سبب ہے، جو لازوال ہے اور جس کی مکمل صفات کا تخیل ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ہمیں خود اپنی بیچارگی اور کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمارا ذاتی احساسِ زندگی یا ہمارے افعال اصل زندگی اور لازوال حیات کے بحرِ ناپیدا کنار میں کیا حیثیت رکھ سکتے ہیں۔ اس خواب آور کیفیت سے بیدار کرنے کے لئے اقبالؒ نے مثال دیکر سمجھایا ہے۔ بارش کے ایک قطرہ کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ سمندر کے سامنے اس کی کیا حقیقت ہے۔

ولیکن ز دریا بر آمد خروشش
ز شرم تنک مایگی رو پوشش
ز موج سبک سیر من زادۂ
ز من زادۂ در من افتادۂ
بیاسائے در خلوت سینہ ام
چو گوہر در خشش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوش قلزم بزی
فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

اس جگہ جستہ جستہ چند وہ اشعار بھی سن لیجئے جن میں اقبالؒ نے ہمارے عملی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

چو موج مست خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت کہ بنشین و پابداماں کش

سمجھاتے ہیں کہ اپنے ارادوں کی تکمیل کی راہ میں جو دشواریاں ہوں ہمت سے دور ہو جائیں گی ؎

بخود نگر گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی
اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

اسی بات کو پھر دوسری طرح سمجھاتے ہیں :-

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

جو لوگ دنیا کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں ان کو تنبیہ ہے کہ دنیا کو برتنا خودی کی تربیت کے لئے لازم ہے۔

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است
کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است

سبق دیتے ہیں کہ عمل کے تسلسل میں زندگانی کا راز مضمر ہے۔

چو موج خیز و بہ یم جاودانہ می آویز
گرانہ می طلبی بے خبر کرانہ کجاست

بتاتے ہیں کہ زندگی اپنے تخیلات و مقاصد میں انہماک اور ارادوں میں استحکام کا نام ہے۔

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

کہتے ہیں کہ زندگی کی راہ میں منزل کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ زندگی عمل کا نام ہے۔ اور بے عمل ہستی کا وجود عدم کے برابر ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

سوال یہ ہے کہ آیا ہر شخص اس کا اہل ہے کہ وہ اپنے لئے جداگانہ ایک لائحہ عمل تیار کرے یا ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کسی ایسے آئین کی پابندی کرے جو مکمل طور سے اس کی زندگی کے ہر پہلو کو برتنے کا طریقہ بتاتا ہو۔ قطع نظر اس کے کہ عموماً صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے ذاتی خیالات اس کے مقاصد زندگی اور اس کے رجحانات ہر دوسرے شخص سے اس قدر مختلف ہیں کہ اگر ہر شخص اپنے لئے نئی راہ عمل

بنائے تو غالباً لاتعداد اور اکثر حالات میں ایک دوسرے سے متضاد خیالات اور اصول زندگی پیدا ہو کر زندگانی ترقی کی طرف جانے کی بجائے افتراق و فسادات کا نمونہ بن کر رہ جائے گی ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہ بر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا جذب عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

یہ دیکھتے ہوئے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زندگی کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے ایک ایسا دستور العمل ضروری ہے جو انسانوں کے نفسیاتی، اخلاقی اور عملی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ جس کی بنیادیں محکم اصولوں پر مبنی ہوں، جو زندگی کی جزئیات اور تفصیلات پر نظر کرتے ہوئے سب کی رہنمائی کر سکے۔ ایسے دستور العمل سے وابستگی ہماری زندگی کی عملی جدوجہد کے لئے ضروری ہے اور قلبی سکون و طمانیت جذبۂ عمل کا پیدا ہونا اور طریقۂ عمل میں استقلال اس وابستگی کے لازمی نتائج ہیں۔

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند — خویش را زنجیری آئین کند
باد را زندان گل خوشبو کند — قید بو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم — پیش آئینے سرِ تسلیم خم
لالہ پیہم سوختن قانون او — می جہد اندر رگ او خون او
باطن ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی

اس کے قبل تذکرہ ہو چکا ہے کہ علم کے حصول میں جو درجہ حواس خمسہ کا ہے حقیقت اصلی کے ادراک میں وہی درجہ قلب کے احساسات و کیفیات کا ہے اور خاص خاص ہستیوں کو "حیات ازلی" کی موجودگی کا اسی طرح احساس ہوتا ہے جس طرح ہم اپنے حواس کے ذریعہ سے مختلف جسمانی اشیاء کو محسوس کرتے ہیں۔ ہستی لازوال کی موجودگی کے مکمل احساس کے وقت ان برگزیدہ انسانوں کے واردات قلبی الفاظ کا جامہ پہن کر زندگی کے اصول بنتے ہیں ؎

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کب تک
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

اقبالؒ کے نزدیک ایسی ہستی کے دیے ہوئے آئین سے وابستگی جس کا تخیل بہتر سے بہتر نقشہ نظام عالم کا اپنے سامنے رکھے اور جو لازوال حیات سے براہ راست واسطہ رکھ کر یہ کہہ سکے کہ ؎

بہ بزم ما تجلی ہاست بنگر
جہاں ناپید و او پیداست بنگر

انسان کی ترقی کی ضامن ہے اور انفرادی استحکام خودی اور اجتماعی ترقی اس آئین سے وابستگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

اقبالؒ نے کس آئین کو بہتر سمجھا اس کی کیا وجوہ تھیں اور اس سے وابستگی کس طرح خودی کو مستحکم کرتی ہے یہ بحث ایک الگ مستقل مضمون چاہتی ہے۔ اتنا ظاہر ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لازوال حیات نے انسان کو شعوری حیثیت دے کر کائنات کے حوادث کو سمجھنے

کی اہلیت دی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ قانون فطرت کو سمجھ کر اس کی تمام قوتوں کو ایسے راستہ پہ لگائے جس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتّب ہو سکے اور جس کی بدولت دنیا بہتر سے بہتر ہوتی جائے۔ حیات کے اس اصل مقصد کو سمجھ کر صحیح راستہ پہ چلنے میں یا دوسرے الفاظ میں اپنی خودی کے صحیح احساس اور اس کے مطابق عمل کرنے ہی میں تسخیر کائنات کا راز مخفی ہے۔

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھینگے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیّل کے کنارے
پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

مگر یہ صورت اسی وقت ممکن ہے کہ انسان لازوال حیات کی ہمہ گیری کے احساس کا اور اپنے آپ کو اس کا ایک جزو سمجھنے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے ورنہ یا تو اس کی عملی قوتیں مردہ ہو جائیں گی۔ یا غلط راستہ پہ پڑ جائیں گی۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو لیساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقیں در کش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

اقبال اور عشقِ رسولؐ صلعم

از

جناب مولوی سیّد محمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی

علامہ اقبالؒ کی حیات میں ان کی شاعرانہ قوت اور فلسفیانہ عظمت کا احساس و اعتراف ہندوستان کے علاوہ ایشیا اور یورپ کے تمام مہذب ممالک کو پوری طرح ہو چکا تھا لیکن ایسے بھی اکثر واقعات ہوتے ہیں جو زندگی میں قابل اعتبار نہیں سمجھے جاتے اور موت کے بعد اس لئے بھی بیان کئے جاتے ہیں کہ دکھے ہوئے دل کچھ نہ کچھ سننا چاہتے ہیں اور کہنے والوں کو معمولی واقعات کے بھی اچھے سننے والے میسر آجاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد ان کی نجی زندگی کا سب سے زیادہ تابناک پہلو جو ہمارے سامنے آیا وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ والہانہ محبت ہے اس طرح ان کی شخصیت جسے ہم اب تک صرف قابل قدر ہی سمجھتے تھے قابل احترام و عقیدت بھی ہو جاتی ہے۔ موصوف باوجود اپنی عمیق فلسفیت اور عقلیت کے حب رسولؐ کی شورش و سرمستی میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ ایک مسلمہ سعادت ہے جو زور بازو سے حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اسی کے ساتھ ایک محقق کے لیے لمحہ فکریہ بھی پیش کرتی ہے کہ مبلغ خودی جو ساری عمر تبلیغ خودی میں صرف کرتا ہے کس طرح عملاً غیر خودی

کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس بات پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فرداً فرداً اور مجموعی طور سے عنوان کے تینوں حصوں پر نظر ڈالیں۔

عشق

اگر تخلیق عالم محض ضرورت کا نتیجہ تسلیم کیا جائے جیسا کہ "مادیین" سمجھتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم میں غیر ضروری اشیاء کا وجود ہی نہیں ہے لیکن بداہتاً ہم دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے اس سے بہت زیادہ سامان عالم کو عطا کیا گیا ہے اور اس بہت زیادہ کے علاوہ حسن و جمال یقیناً موجود ہے اور حسن و جمال کی یقیناً نہ مادے کو ضرورت ہے نہ حیات کو بلکہ مادے اور حیات کے انتہائی نقطۂ ارتقا پر جمال کا ظہور ہوتا ہے جہاں ضرورت کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ اور چونکہ جمال ہی کائنات کی حقیقت ہے اس لئے ارتقائے کائنات کا رخ جمال کی طرف ہے۔ چونکہ محبت جمال ہی کی ایک شکل ہے اس لئے وہ بھی قانون ضرورت کی پابند نہیں ہو سکتی۔

کلیہ ہے کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے اِسی خواہش رجوع کا نام محبت ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ محبت سے کائنات کا کوئی ذرّہ خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لطیف طبیعتوں کی خواہش اور میلان نفیس صورتوں، موزوں آوازوں اور نیک خصلتوں کی طرف

ہوتا ہے کیونکہ ان سب اشیاء کی اصل اور جنس مشترک لطافت و تجرد ہے۔

انسان کا شرف و امتیاز اس کے بلند محسوسات و خصائل ہی کی وجہ سے ہے ورنہ نفس ترکیب اور فیضان حیات کے اعتبار سے انسان اور حیوان برابر ہے۔ تمام انسانی خصائل اور جذبات میں لطیف ترین اور مقدس ترین جذبہ "محبت" ہی ہے کیونکہ وہ حُسن سے اتصال کی خواہش ہے اور اس لئے خود بھی حُسن ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس طرح علم کا شرف اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتا ہے اسی طرح محبت کا معیارِ پستی و بلندی محبوب کی شخصیت سے قائم ہوتا ہے اس لئے انسان سے محبت کرنے والا مکان و حیوان، زر و جواہر سے محبت کرنے والوں سے افضل و اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جسکا محبوب صوری و معنوی کمالات کے اعتبار سے اعلیٰ و افضل ہوگا وہ محبت کرنے والا بھی تمام محبت کرنے والوں سے اعلیٰ و افضل ہوگا۔

تاریخی اور اسلامی نقطہ نظر سے مسلمہ طور پر حضور اقدسؐ کی ذات قدسی صفات کیا باعتبار خصائصِ الوہیت اور کیا باعتبار کمالات عبدیت کامل ترین اور افضل ترین ہے۔ مسئلہ افضلیت سے قطع نظر

یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے ساتھ محبت کرنے والے کی محبت کا تعلق اسی جہتِ اکملیت و افضلیت سے ہے اس لیے اس محبت کے اعلیٰ و افضل ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔ خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُسے اس کے مال و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں (او کما قال) لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے بھی ایمان لمبی داڑھیوں اور اونچے تہمدوں کا نام نہیں بلکہ وہ صرف محبت رسولؐ ہے اور اسلیے علامہ اقبال ان ہزاروں مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے جو جسد شریعت کے بت کے پجاری ہیں اور محبت رسولؐ سے خالی ہیں۔

علامہ بحیثیت مبلغ خودی

علامہ اقبالؒ وحدۃ الوجود کے شدت سے معتقد تھے اس گروہ کا مسلک ہے کہ وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں (لاموجود الااللہ) مسیحیت اپنی تثلیث کی وجہ سے اس عقیدہ سے خالی ہے۔ اسے بھی بدھ مذہب کی طرح ہستی میں خیر سے زیادہ شر نظر آتا ہے عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے جسکا مطلب ہے کہ کوئی آدمی نیک نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بدھ مذہب کا مقصود ہی ہستی کی انانیت کو فنا کرنا اور زندگی کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ عیسائیت کی رہبانیت اور ترک

دنیا اور کفارے کے عقائد کی بنیاد یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت میں صفاتِ الٰہی کا تجسم، قہر و انتقام کی شدت اور ادنیٰ درجے کے تمثیلی بیان اس عقیدے کے لئے راس نہیں ہیں۔ ایرانی مذاہب خیر و شر کی دوئی سے باہر نہ آسکے۔ اس لئے صرف ویدانت کا عقیدہ رہ جاتا ہے جو اسلامی وحدۃ الوجود کے مماثل بھی ہے اور اس سے قدیم بھی۔ ویدانت کے دو بڑے اسکول ہیں۔ ایک کا عقیدہ ہے کہ خالق نے کائنات میں حلول کیا ہے یہ عقیدہ وحدۃ الوجود کے اصولاً منافی ہے کیونکہ حلول یا اتحاد کے لئے ثنویت کا اعتقاد لازمی ہے۔ دوسرا اور بڑا اسکول وہ ہے جسکا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا تمام اشیا باطل اور اعتباری ہیں۔ ہم خدا کو کائنات کے ذریعے سے ادراک نہیں کر سکتے جسمانی تعلقات کا بندھن توڑ کر اسکو پاسکتے ہیں بغیر یہ بندھن توڑے ہوئے آواگون کے چکر سے نکلنا محال ہے معرفت کی انتہا یہ ہے کہ آتما پرم آتما میں اپنے کو فنا کر دے۔

یہاں بھی اصل عقیدے کا پس منظر فنا اور ترک تعلقات ہی ہے۔ لیکن اسلامی وحدۃ الوجود عالم کو عین حق کہتا ہے وہ ترک عالم کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ عالم کو صحیح طور سے سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلامی شعرا نے بہ استثنائے عارف رومیؒ اور شاہ نیاز بریلویؒ اس مسئلے کو پوری طرح نہ سمجھا یا بیان کرنے کی کوشش نہ کی۔ متاخرین میں علامہ اقبالؒ تنہا شخص ہیں جنہوں نے اسے بہتر طریقے پر سمجھا اور بہترین طریقے پر بیان کیا۔

گفت آدم؟ گفتم از اسرار اوست
گفت عالم؟ گفتم او خود رو برو ست (اقبال)

یہ عالم اور یہ رنگ و بو کا محشر حقیقت کے لئے حجاب حقیقی نہیں ہے بلکہ فہم و نظر کے لئے پردہ ہے، لہذا اسلام کسی طرح ترکِ عالم کی تعلیم نہیں دے سکتا کیونکہ ترکِ عالم دراصل ترک حقیقت ہے۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری (اقبال)

محض ہمارے اعتبار سے وجود کی دو جہتیں ہیں ظہور اور بطون، یا ذہنی اور خارجی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت باطن تو جو کچھ تھی وہ تھی ہی لیکن آپ کی جہتِ ظاہر کو موجوداتِ خارجی کی بھی مرکزیت حاصل ہے اور بفحوائے المجاز قنطرۃ الحقیقۃ حضورؐ کی جہت ظاہر زینہ حقیقت ہے اس لئے حقیقت یا خودی تک پہونچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے مرکز کی طرف بڑھیں اسی کا دوسرا نام "محبت رسول" ہے۔ لہذا علامہ اقبال بحیثیت مبلغ خودی کے محبت رسول پر مجبور تھے کیونکہ عرفانِ خودی اور محبت رسول لازم و ملزوم ہیں بلکہ علامہ کے نزدیک حقیقت، خدا، خودی، اور رسول ایک مسمیٰ کے متعدد اسم اور ایک ہی حقیقت کی مختلف جہتیں ہیں۔ جاوید نامے میں فرماتے ہیں۔

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ فرمودہ است

عبدہ از فہم تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہ دہر است و دہر از عبدہ ست
ما ہمہ رنگیم و او بے رنگ و بو است
کس زسرِ عبدہ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِّ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دم او عبدہ
فاش تر خواہی بگو ہو عبدہ

اکثر اصحاب کو علامہ کی خودی کی اصطلاح پر اعتراض ہے وہ اسے قدیم اسلامی تصوف کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ اصطلاح خفا ہونے یا اعتراض کرنے کی چیز نہیں ہے۔ قدیم تصوف میں بھی جگہ جگہ عرفانِ نفس کی تاکید ہے علامہ عرفان نفس کو عرفانِ خودی کہتے ہیں۔ نفس اور خودی میں فرق ہی کیا ہے شاید وجہ اشتباہ یہ ہو کہ قدیم صوفیہ ترکِ خودی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن وہاں انکی مراد خودی سے وہم غیریت ہے یعنی وہ تشخص جو انسان نے مغائر حقیقت قائم کر لیا ہے علامہ بھی

اس خودی کے مبلغ نہیں۔ انکی خودی یہ ہے۔

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

کفِ خاکے کہ دارم از دراوست
گل و ریحانم از ابر تراوست
نہ "من" رامی شناسم من نہ "او" را
ولے دانم کہ "من" اندر بر "او" ست

(اقبال)

صوفیہ متقدمین کے کلام میں جہاں کہیں ترکِ دنیا یا ترکِ خودی کے الفاظ آئے ہیں وہ سب اسی دہم غیریت اور حبِ ماسوا کے لئے مستعمل ہوئے ہیں خود علامہ کو بھی اس اندازِ کلام کے بغیر چارہ نہ ہوا فرماتے ہیں۔

جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

دِل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ در بازاے جواں

ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی

از

جناب الحاج مولانا حامد حسن صاحب قادری

ڈاکٹر اقبال نے "اسرار خودی" میں ایک جگہ افلاطونِ یونانی اور حافظِ شیرازی کے تخیلات کا اثر اقوام اسلامیہ کے تصوف و ادبیات پر دیکھ کر ان دونوں کے مسلک و تعلیم کو قابل احتراز بتایا ہے۔ "زاہدانِ خشک" نے اقبال کے کلام کا سیاق و سباق نہ دیکھا اور مضمون پر غور نہ کیا۔ خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق اقبال کی رائے پڑھ لی اور کفر کے فتوے لگا دیئے۔ اگر واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس تمام بحث کو مطالعہ کرتے تو نظر آتا کہ یہ کفر کا فتویٰ بہت دور تک پہونچتا ہے۔ اس کی تشریح طویل ہے۔ مگر مختصر یہ ہے کہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مسئلہ نفی خودی از مخترعات اقوام مغلوبہ است کہ بایں طریق مخفی اخلاق اقوام غالبہ را ضعیف می سازند" اور اس سلسلے میں ایک دلچسپ حکایت لکھی ہے۔

آں شنیدستی کہ در عہد قدیم گوسفنداں در علف زارے مقیم

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان گوسفندوں پر شیروں نے حملہ کیا اور ان کو تباہ کرنا شروع کر دیا یہ حالت دیکھ کر ایک گوسفند زیرک و کہنہ سال نے وہی تدبیر سوچی جو غلام قوم سوچا کرتی ہے کہ۔

نیست ممکن کز کمالِ وعظ و پند رنگ سبعیت پذیرد گوسفند؟

شیر نر را میش کردن ممکن است غافلش از خویش کردن ممکن است

چنانچہ اس گوسفند نے شیروں کے سامنے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔ "بہر شیراں مرسلِ یزدانیم"۔ اور یہ نصیحت کی کہ

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفی خودی است
روح نیکاں از علف یا بد غذا
تارک اللحم است مقبول خدا
جنت از بہر ضعیفان است و بس
قوت از اسباب خسران است و بس
اے کہ می نازی بذبح گوسفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

چونکہ "قوم شیر از فتح پیہم خستہ بود دل بذوق استراحت بستہ بود"۔ اسلئے شیر دل کو یہ وعظ خواب آور پسند آیا اور انھوں نے "دین گوسفندی" اختیار کرلیا۔ گوشت کھانا چھوڑ دیا، گھاس چرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تیزی دنداں رہی نہ ہیبت چشم شرر افشاں رہی۔ زور تن گھٹ گیا، خوف جان بڑھ گیا۔ بے ہمتی کے سبب سے "کوتہ دستی، بیدلی، دوں فطرتی" پیدا ہو گئی اور

شیر بیدار از فسون میش خفت انحطاط خویش را تہذیب گفت

اس حکایت کے بعد اقبال لکھتے ہیں کہ افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی اسی مسلک گوسفندی پر گئے ہیں اس لئے ان سے احتراز واجب ہے۔

کہتے ہیں:-

راہبِ اول فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گفت سرِ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندی در لباس آدم است — حکم او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است — مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است
ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ او — مے علاجِ ہولِ رستاخیزِ او
نیست غیر از بادہ در بازارِ او — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں خراب از بادۂ گلگوں شود — مایہ دارِ حشمتِ قاروں شود
مفتیِ اقلیمِ او مینا بدوش — محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
طوفِ ساغر کردہ مثلِ رنگِ مے — خواست فتویٰ از رباب و چنگ و نے
در رموزِ عیش و مستی کاملے — از خمے خوں در دلی یا در گلے
رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت — بزمِ رنداں و مے باقی گذاشت
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
در محبت پیروِ فرہاد بود — بر لبِ او شعلۂ فریاد بود
تخمِ نخلِ آہ در کہسار کاشت — طاقتِ بیکار با خسرو نداشت
مسلمِ و ایمانِ او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار

آنچناں مست شرابِ بندگی ست — خواجہ محروم ذوقِ خواجگی ست
دعویٔ او نیست غیر از قال قیل — دست او کوتاہ و خرما بر نخیل
آں فقیہ ملت مے خوارگاں — آں امام امت بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
نل ربائی ہائے او زہر است و بس — چشم او غارتگرِ شہر است و بس
ضعف را نام توانائی دہد — ساز او اقوام را اغوا کند
از بزِ[1] یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجاب اکبر است
نغمۂ چنگش دلیل انحطاط — ہاتف او جبرئیلِ انحطاط
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن[2] دارد حشیش

۱؎ بزِ یوناں زمیں سے افلاطون یونانی مراد ہے۔ جسکے لئے پہلے کہہ چکے ہیں:۔ از گروہِ گوسفندانِ قدیم۔

۲؎ فرقہ باطنیہ کا پیشوا حسن بن صباح۔ اس نے جبل الموط پر ایک باغ بنایا تھا اور اس میں خوبصورت عورتوں کو لاکر رکھا تھا۔ حسن کے مرید لوگوں کو بھنگ پلا کر بیہوشی کی حالت میں اس باغ میں لے آتے تھے۔ جب انکا نشہ اترتا تھا تو سمجھتے تھے کہ ہم بہشت میں آگئے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد پھر اسی طرح بیہوش کر کے ان کو پہاڑ سے نیچے لے آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے تمکو جیتے جی جنت دکھا دی۔ مگر اسی جنت میں پہونچ جاؤ گے اگر ہمارے حکم پر چلو۔ اس دھوکہ میں آکر لوگ جان دینے پر تیار ہو جاتے تھے اور حسن بن صبّاح کے کہنے سے ملک کے بادشاہوں، وزیروں، عالموں، پرہیزگاروں کو قتل کر دیتے تھے۔

از تخیل جنتے پیدا کند | مرتبہ ابر نیستی شیدا کند
ناوک اندازی کہ تاب از دل برد | ناوک او مرگ را شیریں کند
مار گلزارے کہ دارد زہر ناب | صید را اوّل ہمی آرد بخواب
عشق با سحر نگاہش خودکشی ست | کشتنش مشکل کہ مار خانگی ست

حافظ جادو بیاں شیرازی است | عرفی آتش زباں شیرازی است
ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند | آں کنار آب رکناباد ماند
ایں قتیل ہمت مردانۂ | آں ز رمز زندگی بیگانۂ
دست ایں گیرد ز انجم خوشۂ | چشم آں از اشک دارد توشۂ
روز محشر رحم اگر گوید بگیر | عرفیا، فردوس و حوراء و حریر
غیرت او خندہ بر حوران زند | پشت پا بر جنت الماوی زند
بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز | زندۂ؟ از صحبت حافظ گریز
محفل او در خور ابرار نیست | ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

ان اشعار پر "زاہدان خشک" بہت برہم ہوئے۔ اور کفر کے فتوے لگا دئے اقبال صلح پسند طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے رفع شر کے لئے "اسرار خودی" میں سے یہ اشعار خارج کر دئے۔ لیکن اصل میں ان اشعار سے نہ خواجہ حافظ کی ذات پر چوٹ ہے نہ ہیچ تصوف پر کوئی ضرب بلکہ بقول آقائے محیط طباطبائی ایرانی:۔ "در آں مثنوی بہ عرفان سست و تصوف راکد خاموشے تاختہ بود"۔

اقبال نے عرفان شست اور تصوف راکد وجامد پر حملہ کیا ہے۔ کلام حافظ کی تعلیم اور اس کے اثر پر انتقاد کیا ہے۔ افلاطون کے فلسفہ اور اس کے نفوذ پر تبصرہ کیا ہے۔ حافظ کے متعلق جو الفاظ اقبال نے ان اشعار میں لکھے ہیں، وہ اقبال کے اپنے نہیں خود حافظ کے ہیں۔ حافظ کے خرقہ کا رہین ساقی ہونا مے کا علاج ہول رستاخیز ہونا، جام بادہ سے حافظ کی دستار کا آشفتہ ہونا وغیرہ سب مضامین حافظ کے اشعار سے لیے گئے ہیں۔ چنانچہ حافظ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

در ہمہ دیر مغاں نیست چو من شیدائے
خرقہ جائے گرو بادہ و دفتر جائے

خرقۂ زہد مرا آب خرابات ببرد
خانۂ عقل مرا آتش خم خانہ بسوخت

یعنی میرا خرقہ شراب میں گروی ہے۔ میرے خرقۂ زہد کو آب خرابات بہالے گیا۔ خرقہ کے آلودہ یا گروی ہونے کے مضامین حافظ نے کثرت سے لکھے ہیں:-

پیالہ در کفنم بند تا سحر گہِ حشر — بمے ز دل ببرم ہولِ روزِ رستاخیز

یعنی میرے کفن میں پیالہ باندھ دینا تاکہ حشر میں ہول رستاخیز اور دہشت قیامت کو شراب پی کر دل سے دور کر دوں:-

ساقی مگر وظیفۂ حافظ زیادہ بود — کاشفتہ گشت طرّۂ دستارِ مولوی

یعنی حافظ شاید شراب کے وظیفہ میں مشغول تھے کہ یہ کیفیت ہو گئی کہ مولوی صاحب (خود حافظ) کا طرّۂ دستار آشفتہ و پراگندہ ہو گیا۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمتِ قاروں باشی

"اسرار خودی" کے اشعار مذکورہ میں اقبال کا یہ مصرع :-

"دست او کوتاہ و خرما بر نخیل"

بھی خواجہ حافظ ہی کا مصرع ہے جسکو ایک لفظ بدل کر اقبال نے تضمین کر دیا ہے اس شعر سے اقبال کا یہ مقصود ہے کہ حافظ صرف قال و قیل اور باتیں بنانے کے آدمی ہیں۔ سعی و عمل سے جی چراتے ہیں جیسا کہ خود فرماتے ہیں :-

من نمی یابم مجال اے دوستاں
گرچہ او دارد جمالے بس جمیل
پائے مالنگ ست و منزل بس دراز
دست ما کوتاہ و خرما بر نخیل

حافظ کا "امام امتِ بیچارگاں" ہونا یہی ہے کہ بجائے عزم و ہمت کے بیچارگی و بے حوصلگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حافظ اپنے آپ کو "فقیہِ ملتِ میخوارگاں" بھی بتاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

برو در مدرسہ تا چند نشینی حافظ — خیز تا از در میخانہ کشادی طلبیم
اگر امام جماعت نخواندش امروز — خبر کنید کہ حافظ بے طہارت کرد

مے سے طہارت کرنا بھی "فقیہِ ملتِ میخوارگاں" ہی کی شرع کا فتویٰ ہو سکتا ہے۔

اقبال کو مسلک حافظ پر اعتراض کرنے میں حافظ کی اس ذات اور ان اخلاق

اور اس تعلیم سے بحث نہیں جو فی الواقع ہوگی۔ وہ تاریخی و تنقیدی نظریں نہ محقق و مسلّم ہے نہ اب اس کا کوئی اثر ہے۔ بلکہ حافظ کی اس ذات اور ان اخلاق اور اس تعلیم سے اقبال کو تعلق ہے جو "تصوف و ادبیات اسلامیہ" پر موثر رہی ہے اور ہے اس بات سے مطلق انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ افلاطون "منکر ہنگامہ موجود" اور "خالق اعیان نامشہود" تھا۔ افلاطون کے فلسفہ نے شروع ہی سے اسلامی علم و ادب اور مذہب و تصوف پر اثر کیا۔ اسی کے فلسفہ سے "وحدت وجود" یا "توحید وجودی" کا مسلک نکلا اور تمام عالم طریقت پر چھا گیا۔ اور شعر و ادب میں بھی یہ مسائل عام ہو گئے:۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

جب یہ مسائل ذہن نشین ہو جائیں گے تو "ذوق عمل سے محرومی" اور "نفس تمنا" یقینی ہے۔ تمنا اور عمل انسان کے فطری تقاضے ہیں۔ اسلام تمام اہل و عمل ہے۔ لیکن حافظ سب کو "غرق مے ناب اولیٰ" سمجھتے اور سمجھاتے ہیں:۔

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است
ساقیا برخیز و در دہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را
حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را
عہد و پیمان فلک را نیست چندان اعتبار عہد با پیمانہ بندم شرط با ساغر کنم

حالانکہ مسلمان کے لئے راز دہر کوئی معمہ نہیں، مسلمان اسی راز کی جستجو کرنے اور سمجھانے کے لئے آیا ہے بلکہ مسلمان خود اس معمے کا حل ہے۔ یہ تو

خواجہ حافظ کے الفاظ پر تبصرہ تھا۔ حقیقت میں خواجہ صاحب کے شعر میں یہ تعلیم نکلتی ہے کہ علم و حکمت میں نہ پڑو۔ مسائل فلسفہ کی بحث چھوڑ دو۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اس قسم کے اشعار سے یہی اثر قلوب و طبائع پر ہوا ہے۔ حالانکہ یہ تعلیم نہایت ناقص اور سخت مضر ہے۔ مسلمان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

الحکمۃُ ضالّۃُ المؤمن (حکمت اور دانائی مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں ملے اس طرح اٹھا لے کہ یہ اس کی کوئی چیز ہے۔ گم ہو گئی تھی اب مل گئی)

خواجہ حافظ اس کے بدلے جو شغل تعلیم فرماتے ہیں یعنی "حدیث مطرب و مے" وہ مجازی معنوں میں بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حافظ صہبا گسار تھے یا ان کی صہبا سے مراد شراب معرفت نہیں ہے۔ انھوں نے پیالہ میں عکس رُخ یار دیکھا ہوگا۔ بلکہ پیالۂ شراب میں نہیں، پیالۂ دل میں دیکھا ہوگا۔ لیکن اُنکا پیالہ اور اُنکا دیکھنا ان کے ساتھ گیا۔ اب ہمارے لئے ان کا کلام اور اس کا اثر ہے۔ ان مسائل کے بیان میں حافظ تنہا نہیں ہیں۔ دوسروں نے بھی لکھے ہیں۔ لیکن اتنا شیریں بیان کوئی نہ تھا۔ اس کثرت سے کسی نے نہیں لکھے۔ اسی لطف سخن کے سبب سے خواص و عوام سب میں حافظ کو قبول خاطر حاصل ہوا۔ حافظ کا یہ پیام کہ "در عیش کوش و مستی"۔ "بمے سجادہ رنگیں کن"۔ "در عیش نقد کوش"۔ "حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو"۔ اور طریقت و معرفت کی طرف اس کا اشارہ صرف ارباب معرفت اور اہل راز سمجھ سکتے تھے۔ عوام کی نظر اس کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک نہیں پہونچ سکتی۔ حافظ کے اس پیام اور اس بیان کی شیرینی

دل آویزی عوام پر جیسا اثر کر سکتی ہے ظاہر ہے۔ اسی بنا پر اقبال نے صرف حافظ کا نام لیا ہے۔ ورنہ ان کے اعتراض کی زد میں اس طرح کے سب شاعر ہیں۔ حافظ کی ذات سے اقبال کو بحث نہ تھی۔ بلکہ صوفیوں اور صوفی شاعروں کے اس مسلک سے بحث تھی۔ یہ مسلک جس کو خواجہ حافظ ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:۔

مقام امن و مے بیخش و رفیق شفیق
گرت مدام میسّر شود زہے توفیق
جہان و کارِ جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

اصل میں صوفیوں کا ایک "حال" تھا "مقام" نہ تھا، منزل مقصود نہ تھا۔ اور محض "حال" کے اعتبار سے خواجہ حافظ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر صوفی کا یہ "حال" اس کا "مقام" ہو جائے جیسا کہ خواجہ عطار وغیرہ کا ہو گیا تھا تو بلا شبہہ یہ بھی بڑے مرتبہ کی بات ہے اور بیشک اس کی تعریف کی جائے گی، اس لئے کہ حال کا مقام ہونا بہت دشوار بات ہے۔ یعنی یہ مرتبہ آسان نہیں ہے کہ ایک کیفیت جو کبھی کبھی دل پر وارد ہوتی ہے اور "حال" کہلاتی ہے، جم جائے اور مستقل طور پر قائم ہو جائے گویا صوفی کا "مقام" اور جائے قیام بن جائے۔ لیکن اگر اس "مقام" کو منزل مقصود سمجھ لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اب اس سے آگے کوئی درجہ اور کوئی مقام نہیں ہے تو پھر نہ صرف حافظ و عطار پر بلکہ خود شیخ اکبر محی الدین ابن عربی پر بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

اور کیا گیا ہے۔ تصوف کی کتابیں اس ردوقدح سے بھری پڑی ہیں۔ صرف علمائے ظاہر نے نہیں، بڑے بڑے صوفیائے کرام نے بحثیں کی ہیں۔ پھر ایک اقبال نے حافظ پر اعتراض کر دیا تو کیا عجیب بات تھی۔ لیکن بات وہی تھی کہ حافظ کی مقبولیت نے اقبال پر کفر کے فتوے دلوائے۔ اگر حافظ کی جگہ حکیم فارابی یا بو علی سینا کا نام لیتے تو کوئی توجہ بھی نہ کرتا۔

اس مسلک و مسئلہ کی تاریخ بہت طویل ہے۔ تفصیل میں پڑنے کا موقع نہیں۔ یہ سب مسئلہ وحدت الوجود کی شاخیں اور اس کے تاثرات ہیں۔ اس مسلک کی بنیاد حکمائے یونان سقراط و افلاطون وغیرہ کا فلسفہ ہے۔ دوسری صدی ہجری سے یہ فلسفہ اسلامی تصوف پر اثر انداز ہوا۔ پھر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اس کے سب سے بڑے مبلغ ہوئے۔ رفتہ رفتہ صوفیوں کے تمام فرقے اس کے زیر اثر آ گئے۔ اہل راز اور ارباب نظر نے وحدت الوجود کی صداقت و حقیقت کو چشم باطن سے دیکھا ہے اس لئے کسی کو اس میں مجال گفتگو نہ ہونی چاہیئے۔ میں اولیاء اللہ کو نائب رسولؐ مانتا ہوں۔ اور بجز نبوت اور خصائص نبوت کے تمام صفات نبوت کا حامل یقین کرتا ہوں۔ یہ وصف نبوت اور مدح الٰہی کہ "ما زاغ البصر وما طغیٰ" اور "ما کذب الفواد ما رای" بلا شبہہ کمال صداقت کے ساتھ تو صرف حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی کے لئے موزوں ہے۔ لیکن اس کا پرتو اولیاء اللہ پر بھی پڑا ہے۔ ان کی نگاہ بھی اسرار الٰہی کو دیکھنے میں غلطی نہیں کرتی اور ان کا دل بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ انھوں نے وحدت الوجود کی حقیقت کو جیسا دیکھا اور پایا بلا شبہہ درست ہے

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ سلوک و طریقت کی ایک "راہ منزل" تھی "منزل" نہ تھی۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں (اقبال)

بہرحال یہ درمیانی اسٹیشن ہو یا ٹرمینس، اس کا تعلق صوفیوں کی ذات سے تھا۔ ان کے حال و مقام تک رہتا تو دنیا والوں کو نہ اس کی خبر ہوتی نہ تعلق نہ "دخل در معقولات" کی ضرورت۔ لیکن اصحاب تصنیف اور ان سے زیادہ شاعروں کی بدولت یہ مسائل و مضامین نئی نئی عبارتوں، بیانوں، استعاروں میں آئے اور عام ہوئے۔ تو ان کا اثر ہونا ہی تھا۔ اسی اثر سے اقبال کو اور مجھے بحث ہے۔

خواجہ حافظ اوپر کے دو شعروں (بقوانی توفیق و تحقیق) میں فرماتے ہیں کہ "میں نے خوب تحقیق کر لیا ہے کہ جہان و کارِ جہاں سب ہیچ ہے۔ اس لئے اگر مجھے مقام امن اور معرفت الٰہی (بے بیغش) اور شیخ کامل (رفیق شفیق) کی صحبت میسّر ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کیا توفیق الٰہی ہوگی"۔ لیکن یہ مسلک اسلامی تعلیم۔ اسوۂ حسنہ نبوی مقصد خلافت الٰہی اور مدعائے تخلیق عالم کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تعلیم خود نبی کریم نے ارشاد نہیں فرمائی۔ "خیر القرون قرنی" میں اس کی تلقین نہیں ہوئی۔ پہلی صدی ہجری میں بلکہ دوسری صدی تک صوفیائے کرام نے یہ ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا زہد رہبانیت تک پہونچتا ہے۔ دنیا دارالعمل ہے۔ انسان عمل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمام دنیا بلکہ تمام عوالم انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تمام موالید و عناصر کی تسخیر کے لئے انسان کو

بھیجا گیا ہے۔ کیا یہ مقصد "جہان و کار جہاں کو ہیچ در ہیچ" سمجھنے سے پورا ہو سکتا ہے۔ انسان کے لئے سب سے پہلے اس کی جان اور اس کا جسم ہے۔ اس کی خواہشیں قوتیں اور قدرتیں ہیں۔ ان میں سے کسی سے غافل رہنا یا کسی کو بیکار رکھنا مقصد خداوندی نہیں ہے۔ ان سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کے بعد انسان کے سامنے تمام دنیا ہے۔ اور اس کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ ان سے بہتر سے بہتر طریقے پر عہدہ برآ ہونا انسان کا مقصد حیات ہے۔ یہی مذہب ہے اور یہی تصوف ہے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست (سعدیؒ)

انسان کی زندگی آرزو اور عمل سے مرکب ہے۔ آرزو کی تحدید اور عمل کی تہذیب ہر مذہب کا اور سب سے بڑھ کر مذہب اسلام کا کام ہے۔ اور یہی چیز تصوف ہے۔ اسلام کے احکام کو باحسن وجوہ عمل میں لانے کا نام تصوف ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو حسین ترین شکل میں انسان کے سامنے پیش کرنا اور دل کے لئے مرغوب و محبوب بنانا تصوف کا مقصد و مدعا ہے۔ تصوف کے اعمال و اشغال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عبادات اور معاملات انسان کی نظر میں مہیب و خوفناک نہیں رہتے۔ حسین و محبوب بن جاتے ہیں۔ ان پر عمل کرنا گراں نہیں گذرتا بلکہ عمل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جی چاہنے لگتا ہے۔ لیکن اس سے انسان کی زندگی کے کسی مرحلے میں کسی شغل کسی آرزو کسی مقصد میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس کی مثال موجود ہے۔ شہادت سامنے ہے۔ حضور نبی کریم اور

خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام سے بڑھ کر کون صوفی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بزرگ تمام لوازم حیات اور مشاغل زندگی پر عامل تھے۔ بس ان کا اتباع کرنا اور اسی طرح دنیا میں عمل کرنا اور پیہم عمل کرتے رہنا اسلام بھی ہے اور تصوف بھی۔

لیکن پھر وہی سوال ہے کہ کیا یہ اتباع خواجہ حافظ کے مشورے پر عمل کرنے سے ممکن ہے۔ بلاشبہہ انسان کا مقصد اوّلین خدا کی محبت معرفت اور عبادت ہے:۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے)۔ لیکن کیوں؟ اس لئے کہ خدا کی محبت خدا کی معرفت اور خدا کی عبادت سب سے پہلے انسان کی موجودہ زندگی اور اس دنیا کے اعمال و اشغال میں کام آتی ہیں۔ سب سے زیادہ ان کی ضرورت اس حیاتِ فانی کے لئے ہے۔ خدا کا کوئی حکم، رسولؐ خدا کا کوئی ارشاد، اسلام کا کوئی قانون، تصوف کا کوئی ذکر و شغل ایسا نہیں جس کی انسان کو دنیوی زندگی کے لئے ضرورت نہو۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ روزمرّہ کے مشاغل زندگی میں حاصل نہوتا ہو۔ بلکہ اگر "زاہدِ خشک" کفر کا فتویٰ نہ لگا دیں تو شاعرانہ اسلوب بیان میں کہنا چاہئے کہ خود خدا بھی انسان ہی کے لئے ہے (چونکہ میں بھی اقبال کی طرح زاہدِ خشک سے ڈرتا ہوں اس لئے اس جملے کی تشریح کرتا ہوں کہ حقیقت میں تو خدا اپنے ہی لئے ہے۔ خود بخود ہے، بخودی خود مستقل اور حیّ و قائم ہے۔ لیکن اس کا اپنے آپ کو خدا کہنا اور کہلوانا، انسان کے لئے تھا۔ اس کو اس کہنے اور کہلوانے، بتانے اور منوانے کی اپنے لئے ضرورت نہ تھی، لیکن انسان کے لئے ضرورت تھی، اس کا وجود کسی کے لئے نہیں۔ لیکن اسکا ظہور

انسان کے لئے ہے) غرض فوقِ ثریا سے تحت ثریٰ تک، جملہ کائنات انسان کے تصرف کے لئے خلق کی گئی ہے۔ فرشتوں پر انسان کو برتری ہے۔ عناصر پر انسان کو غلبہ ہے۔ آسمان انسان کے تھیگلی لگانے کیلئے ہے۔ پہاڑ انسان کے توڑنے پھوڑنے کے لئے۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ و نائب ہے۔ خدا نہیں ہے۔ مگر اور سب کچھ ہے۔ اوپر خدا نیچے انسان۔ خدا کی خدائی۔ انسان کی خودی۔ اقبال نے "خودی" کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کی ہے۔ خدا کی "خدائی" کا جو مفہوم ہے۔ وہی انسان کی "خودی" کا ہے خدا "حقیقی خدا" ہے۔ انسان "مجازی خدا"۔ (یہ نظریہ اقبال کی ایجاد نہیں۔ وہ صرف اسکے مفسّر و مبلغ ہیں۔ انسان کو اپنا خلیفہ بنانا اور اپنی صورت پر پیدا کرنا یہی معنی رکھتا ہے۔ اس مفہوم کے لئے خودی سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا تھا) جس طرح خدا سے اس کی صفت خدائی جدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انسان سے اسکا وصفِ خودی جدا نہ ہونا چاہیئے۔ یہ لفظ میں نے اس لئے لکھا کہ خدا کی صفات قدیم و واجب و غیر منفک ہیں۔ لیکن انسان کی صفات حادث و ممکن و قابل انفکاک ہیں۔ خدا اپنی خدائی کے منافی کام نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی خودی کے خلاف کر سکتا ہے۔ اگرچہ پھر وہ انسان کے درجہ سے گر جاتا ہے۔ انسان اسی وقت تک انسان ہے جب تک اپنی "خودی" کو قایم رکھے، خلافت الٰہی کا حق ادا کرے۔ اور اپنی "خودی" سے خدائی کرتا رہے۔

لیکن اب پھر اسی سوال کو لیجیے، کہ کیا یہ "خودی و خدائی" زہد خشک ترک دنیا سے قائم و کارفرما رہ سکتی ہے؟ انسان کی خلافت الٰہی اور

خدائی، عالم بالا کے لئے نہیں، مابعد الحیات کے لئے نہیں، عقبیٰ و آخرت کے لئے نہیں، اسی مادی زندگی اور عالم مجاز اور حیات ناپائدار کے لئے ہے۔ اسی گوشت پوست اور آب و خاک کی دنیا کے لئے ہے۔ ارشاد الٰہی کس قدر واضح ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ اس زمین میں خلیفہ بنایا گیا ہے۔ اس زمین پہ خلافت کرنی ہے۔ سب سے پہلے یہ عالم اور یہ زندگی ہے۔ دوسرا عالم اور دوسری زندگی اس کے بعد کی بات ہے۔ اور وہ بھی حقیقت میں اسی زندگی کے لئے ہے۔ اسی زندگی کے سبب سے ہے۔ اسی زندگی کا نتیجہ ہے۔ قیامت اور اس کا حساب کتاب بالکل برحق، لیکن وہ اسی زندگی کا محاسبہ ہے، اسی زندگی کا عکس ہے، اسی زندگی کی مثال ہے، اسی زندگی کے بننے یا بگڑنے کی تصویر ہے، بلکہ اسی زندگی کی ساختہ و پرداختہ ہے، اسی زندگی کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ وہاں کے گلزار و خارستان کے لئے پھول اور کانٹے یہیں سے جاتے ہیں۔

در جہنم نیست سوز و التہاب می رویم و با خود اخگری بریم

لیکن جانا بھی یقینی اور گل تر یا اخگر ساتھ لے جانا بھی یقینی۔ نہ موت سے مفر نہ حساب کتاب سے جائے گریز۔

اس دنیا اور اس زندگی میں انسان کو جماد نبات و حیوان بن کر نہیں، انسان بن کر رہنا ہے۔ خلیفۃ اللہ بن کر رہنا ہے۔ اور انسانوں میں سب سے زیادہ یہ حق "مسلمان" کو پہونچتا ہے۔ جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے، اسی طرح مسلمان اشرف انسانات ہے۔ شخصی انسانیت کی تکمیل

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس سے ہوئی ہے اور قومی انسانیت کی تکمیل مسلمان سے۔ لیکن مسلمان کی تکمیل انسانیت بھی سب سے پہلے اسی مادّی دنیا اور فانی زندگی کیلئے ہے۔ قلب کی صفائی اور روح کی پاکیزگی سب سے پہلے اسی جسم وجان اور گوشت پوست کیلئے درکار ہے۔ عبادت وریاضت سب سے پہلے اسی معیشت ومعاشرت کیلئے مفید ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان عابد وزاہد ہے، متقی وپرہیز گار ہے، ذاکر وشاغل ہے سُکر یا صحو میں رہتا ہے، مجاہدہ وریاضت کرتا ہے مراقب و معتکف رہتا ہے۔ لیکن اپنے ماحول سے بے خبر ہے، اپنے اہل وعیال، ہمسایہ، دوست ودشمن، قوم وملک سے بے نیاز ہے۔ مجاہدہ و اعتکاف کی سبب سے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ زہد وریاضت کی وجہ سے اتباع سنّت میں قاصر رہتا ہے۔ عبادت کے شوق میں خدمت خلق سے غافل ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ وہ خلافت الٰہی اور نیابت نبوّت کے منشا ومقصود کو پورا نہیں کرتا۔ تکمیل انسانیت کا منصب نہیں رکھتا۔ لیکن خواجہ حافظ شیرازی کی یہ رائے ہے کہ

حاصل کارگہِ کون ومکاں ایں ہمہ نیست
باده پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

یعنی کون ومکان کے کارخانے سے کچھ ملنے والا نہیں اور اسباب جہاں سب بیکار ہیں۔ ہر وقت یاد الٰہی میں رہو (باده پیش آر) میں اہل تصوف کی تعبیر وتشریح کے مطابق حافظ کے ساغر وباده، رند ومیخانہ، شاہد ومعشوق سے

محبت و معرفت الٰہی، صوفی و سالک، مرشد و شیخ مراد لے رہا ہوں۔ لیکن خدا اور خدا کے رسول اور قرآن اور اسلام بلکہ خود اولیاے کرام و صوفیاے عظام نے کہیں جہان و اسباب جہاں سے قطع نظر کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور یاد الٰہی میں مصروف رہنے کی یہ صورت کہیں تجویز نہیں کی کہ سالک و صوفی دنیا کے فرائض و حقوق سے غافل و بے نیاز ہو جائے۔ مسلمان کو "دل بیار و دست بکار" رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے موقع پر دو آدمی دیکھے، ایک بہت بلند ہمت اور ایک نہایت پست ہمت۔ پست ہمت وہ تھا جو خانۂ کعبہ کے پردے کو پکڑے ہوئے خدا سے دنیا کی آرزوئیں مانگ رہا تھا۔ اور بلند ہمت وہ جو بازار منا میں چالیس ہزار درم کا سودا کر رہا تھا لیکن اس کا دل ایک لمحہ کے لئے یاد الٰہی سے غافل نہ تھا۔ یہ ہے اتباع سنّت اور حاصل تصوف۔

اسی قسم کی بلند ہمتی اور استحکام خودی کی تعلیم و تبلیغ کے سبب سے اقبال نے حافظ کے مقابلے میں عرفی کو ترجیح دی ہے:

باده زن با عرفیِ ہنگامہ خیز زندهٔ؟ از صحبت حافظ گریز

دونوں کا ایک دلچسپ موازنہ دیکھئے۔ اس غزل میں جس کا مطلع اوپر لکھا گیا خواجہ حافظ فرماتے ہیں:۔

دولت آنست کہ بے خون دل آید بکنار
ورنہ با سعی عمل باغ جناں ایں ہمہ نیست

یعنی بغیر محنت و مشقت کے دولت ہاتھ آئے تو ایک بات ہے۔ ورنہ کوشش

اور محنت سے باغ جناں بھی ملے تو کچھ نہیں۔ لیکن عرفی کی ہمت دیکھئے:۔

بضاعتے بکف آور کہ ترسمت فردا

بخوے فشانیِ پیشانیِ حیا بخشند

کہتا ہے کہ مغفرت حاصل کرنے کیلئے پہلے سے محنت کرکے بضاعت حاصل کرلے۔ ایسا نہو کہ کل بازار مغفرت میں تیرے پاس کچھ پونجی نہو اور تجھے شرمندگی سے پسینے پسینے دیکھ کر اور تجھ پر ترس کھا کر جنس مغفرت مفت ہی دیدیں۔ شیخ سعدیؒ بھی ایسا ہی فرماتے ہیں:۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بباغ مردی ہمسایہ در بہشت

عرفی نے بلند ہمتی کے مضامین کثرت سے لکھے ہیں۔ اسی سبب سے اقبال نے حافظ کے مقابلے میں عرفی کی مثال دی ہے۔ ورنہ اقبال کو دونوں کی ذات اور اخلاق سے کچھ بحث و تعلق نہیں۔ حافظ نے ہر جگہ پست ہمتی، بیہودی عمل، ترک دنیا، سکر و محویت کی تلقین کی ہے اور ایسے ایسے لطیف و شیریں طرز و بیان میں کہ عوام و خواص سب گرویدہ ہیں۔ کچھ آج نہیں، ہمیشہ سے حافظ کا کلام مقبول رہا ہے۔ اس کا سبب شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ حافظ کی تعلیمات و بیانات اُس زمانے کی حالت کے مطابق تھے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) سے عجم و ہند میں سیاسی انقلابات اور ملکی تباہیوں نے مسلمانوں کو پست ہمت، تارک عمل، عافیت پسند بنانا شروع کر دیا تھا۔ صوفیوں نے بھی اسی قسم کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ امراء و رؤسا

اور ان کے اثر سے متوسط طبقے کے اخلاق برباد ہونے لگے تھے۔ حافظ کی شاعری ان تاثرات کا نتیجہ تھی۔ اور پھر خود اس زمانے کی طبائع پر موثر بھی ہوئی۔ حافظ کی مسلّم بزرگی و ولایت کے سبب سے لوگوں نے حافظ کے کلام کو مرشد کا ارشاد اور قرآن و حدیث کی تفسیر سمجھا۔ صوفیوں کے اکثر گروہ کچھ اپنے طریقوں کے اصول کی بنا پر اور کچھ گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے اہل سلسلہ کو لوث دنیا سے محفوظ رکھنے کیلئے اسی قسم کی تعلیمات فرمانے لگے تھے۔

خواجہ حافظ آٹھویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بعد دو سو برس کے اندر اسلام اور تصوف کی کایا پلٹ گئی۔ یہانتک کہ ایران میں شاہان صفویہ اور ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کے عہد سے اسلام و تصوف کی اصلی روح پر پردہ پڑ گیا۔ جمود، بے عملی، پست ہمتی، عیش پسندی، تقریباً تمام دنیا کے مسلمانوں میں عام ہو گئی تھی۔ ایران و ہند میں شاید سب سے زیادہ تھی۔ قومی عصبیت اور فرقہ پرستی کا زور سب سے زیادہ اسی زمانے میں ہوا۔ ہندوستان میں اکبر و جہانگیر کے عہد اس لحاظ سے دورِ ابتلا تھے۔ اُمراء کا تعیش حد سے گذر گیا تھا اور رعایا اس رَو میں بہی جا رہی تھی، ملکی سیاست نے اخلاقی تباہی پیدا کر دی تھی، ہندوؤں کی آمیزش سے مذہب، معیشت، معاشرت میں اسلامی صفائی و بے لوثی باقی نہ رہی تھی۔ اہل باطن اور ارباب تصوف خود اپنے جہاد نفس میں ایسے مشغول تھے کہ ملک و ملّت کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ پاتے تھے۔ خانقاہ نشینی، عافیت گزینی، ترک لذات، مجاہدات و ریاضات ان کے اشغال تھے۔ عالم و پرہیزگار مسلمانوں میں قرآن و حدیث

کا درس و تدریس اور احکام شریعت کی پابندی تو بہت تھی، لیکن اتباع سنّت کا اہتمام شاذ و نادر تھا۔ عام مسلمانوں میں اسلامی احکام سے غفلت، اسلامی اخلاق سے بے پروائی، نفس پرستی، دوں فطرتی، حقوق العباد کو سمجھنے اور ادا کرنے سے بے توفیقی شائع و عام تھی۔

اگر اسلام اور مسلمانوں کیلئے، کبھی کسی مُجدّد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ زمانہ یہی تھا۔ چنانچہ عین ضرورت کے وقت حضرت مُجدّدِ الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ العزیز کا اکبر و جہانگیر کے عہد میں ظہور ہوا۔ اکبر کی بے دینی اور جہانگیر کی غفلت شعاری کے زہر قاتل کا تریاق حضرت مجدّد صاحب کی ذات سے بہتر ممکن نہ تھا۔ ان بے توفیق اور پست ہمت لوگوں کے لئے مجدّد صاحب جیسے صاحبِ توفیق اور بلند ہمت شخص کی ضرورت تھی جن کی شان بقول ڈاکٹر اقبال کے یہ ہے:-

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

سرمایۂ ملّت یعنی ایمان، اخلاق، معاشرت، شریعت، طریقت، اتباع سنّت کی بروقت نگہبانی جیسی حضرت مجدّد صاحب نے کی، اس زمانے کے حالات جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اگر مجدّد صاحب کا ظہور نہ ہوتا تو سرمایۂ ملّت کے برباد ہونے میں کسر نہ رہی تھی۔ بادشاہ اور امراء، علمائے کرام اور

صوفیان عظام سب مجدّد صاحب کے دشمن تھے، لیکن بقول اقبالؔ:۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولےٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مجدّد صاحب جہانگیر کے سامنے بھی حق گوئی سے باز نہ رہے۔ آخر خود جہانگیر کو جھکنا پڑا اور آداب دربار و احکام سلطنت سے ان تمام غیر شرعی قواعد کو خارج کرنا پڑا جنکا مجدّد صاحب نے مطالبہ کیا تھا۔ مجھے اس مضمون میں ان تفصیلات سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ اپنے موضوع مقالہ کے سلسلے میں یہ بات دکھانی ہے کہ حضرت مجدّد صاحب نے صرف اصلاح شریعت کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ تصوف اور طریقت کی بھی تجدید کر دی۔ اس زمانہ کے تصوف اور صوفیوں پر وہی رنگ غالب تھا جو خواجہ حافظ شیرازی کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ اور اس کا سرچشمہ، جیسا کہ پہلے کہا گیا، "وحدت الوجود" کا مسئلہ یعنی اس کو منتہائے سلوک سمجھنا تھا۔ حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہٗ نے صوفیوں کے اس خیال کی پرزور اور مدلّل تردید کی۔ مجدّد صاحب جس مرتبہ کے صاحب نظر و صاحبدل تھے، اس کی تصدیق بڑے بڑے اولیاء اللہ اور اہل قلب و نظر ہر زمانے میں کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "تمام صوفیائے عظام میں دو بزرگ میری نظر میں سب سے ممتاز ہیں۔

ایک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ۔ اور میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان دونوں میں کون بڑا ہے"۔

حضرت مجدّد صاحب نے فرمایا کہ میں تمام مقامات سلوک سے گذرا ہوں۔ "وحدت الوجود" کے مقام پر بھی پہنچا، اور وہاں ایسی کیفیت پائی کہ دل چاہتا تھا کہ یہیں رہیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور معلوم ہوا کہ مقام وحدت الوجود منتہائے عروج نہیں ہے۔ اس سے آگے سالک کو سفر کرنا ضروری ہے۔ میں آگے بڑھا اور آگے بڑھا۔ سب سے آخر میں مقام "عبدیت" میں پہنچا اور وہاں یہ معلوم ہوا کہ آخری مقام یہی ہے اس سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں۔ یہی مقام محمود ہے اور یہی مقام محمدیؐ ہے۔ مومن و سالک کی معراج یہی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل پیروی واتباع کرے اور ان کا ساعَبْدُہٗ (بندۂ خدا) بن جائے۔ شریعت و طریقت کا منتہائے کمال یہی ہے۔ دوسرے تمام مقامات وحدت شہود، وحدت وجود، ظلیت وغیرہ اس سے پست تر ہیں اور سب اس منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے درمیان راہ کی سیر گاہیں اور منزلیں ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ مومن کی بازگشت محمد رسول اللہ کی طرف ہو۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

شیخ سعدیؒ بھی ایسا ہی فرماتے ہیں:۔

میندار سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز بر پے مصطفےٰ

"راہ صفا" کا لفظ قابل توجہ ہے۔ یعنی صفائے قلب کا راستہ، تصوف کا طریقہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلا جائے تمام علمائے امت اور صوفیائے ملت اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ صوفیوں کے تمام فرقوں اور سلسلوں کی بنیاد محبتِ خدا، عشق مصطفےٰ اور اتباع سنت پر ہے۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز کی نظر سے دیکھا جائے تو "بر پیِ مصطفےٰ رفتن" اور "بمصطفےٰ رسیدن" پر صرفِ ہمت اور اس کا کامل اہتمام اس زمانے کے علماء و ارباب طریقت میں شاذ و نادر رہ گیا تھا۔ اسی لئے مجدد صاحب نے کامل اتباعِ شریعت اور مستحکم پیروی سنت پر زور دیا۔ صوفیوں کے جتنے عقائد و اصول اور اعمال و وظائف شریعت و سنت کی راہ میں حائل تھے، ان سب کو ناجائز یا غیر ضروری قرار دیا اور اپنے سلسلے سے خارج کر دیا۔ مجدد صاحب کے نزدیک ہر مسلمان اور صوفی کی تمام زندگی سراسر سعی و عمل ہے۔ اخلاق کی درستی، معاملات کی صفائی، خلق اللہ کی خدمت اصل الاصول ہے۔ یہی رسول کریم اور صحابۂ کرام کا عمل تھا۔ وہاں نہ ترک ذات تھا نہ ترک علائق نہ ترک دنیا نہ گوشہ نشینی نہ چلہ کشی۔ خدا کے ساتھ ان کا معاملہ یہ تھا کہ رات رات بھر جاگتے اور عبادت و ذکر و شغل میں مصروف رہتے۔ اور بندوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا کہ دن بھر ارشاد و ہدایت، خدمت خلق، ادائے حقوق العباد، ایثار و جاں نثاری میں ہمت صرف فرماتے۔ اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی و پابندی ہر صوفی و صاحب طریقت کا فرض ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا، صدہا سال سے صوفیوں کے مختلف مسالک و

عقائد مثلاً وحدت وجود، ترک خودی، فنافی الذات، ترک علائق، خود فراموشی، عزلت گزینی، سکر و جذب، مجاہدہ و چلہ کشی اسقدر جاذب و موثر، شائع و معمول، مرغوب و مقبول ہو گئے تھے کہ لاکھوں بندگان خدا ان پر عمل پیرا تھے یا ان کو واحد مقصد حیات، اصل تصوف اور ذریعۂ مغفرت، و وسیلۂ نجات تصور کرتے تھے۔ اور یہ مسائل ادبیات اسلامیہ میں داخل ہو کر عوام کی زبانوں پر جاری اور دلوں میں نافذ و ساری ہو گئے تھے۔

فارسی کے سب سے پہلے صوفی شاعر جو خود بڑے مرتبہ کے عارف تھے اور جنہوں نے سب سے پہلے فارسی شاعری میں مضامین و مسائل تصوف داخل کئے یعنی حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۴۴۰ھ) اپنی مشہور رباعیات میں فرماتے ہیں:-

تا ترک عوائق و علائق نکنی
یک سجدۂ شایستہ و لائق نکنی
حقا کہ ز دام لات و عزّیٰ نہ رہی
تا ترک خود و جملہ خلائق نکنی

وحدت الوجود اور "ہمہ اوست" کے متعلق فرماتے ہیں:-

گفتم کہ "کرائی تو بدیں زیبائی"؟
گفتا، "خود را کہ من خودم یکتائی
ہم عشقم و ہم عاشق و ہم معشوقم
ہم آئینہ، ہم جمال، ہم بینائی"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

بودم ہمہ بیں، چو تیز بیں شد چشمم
دیدم کہ ہمہ توئی و دیگر ہمہ ہیچ

اور ایک رباعی کا شعر ہے:۔

روزے کہ "انا الحق" بزباں می آورد
منصور کجا بود۔ خدا بود خدا

ایک اور رباعی ہے:۔

آنرا کہ فنا شیوہ و فقر آئین است
نہ کشف و یقیں نہ معرفت نہ دین است
رفت او زمیاں۔ ہمیں خدا ماند خدا
اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ ھُوَ اللّٰہ این است

یعنی فقر کی تکمیل یہ ہے کہ بندہ کی ہستی کچھ نہ رہے۔ اس کے پیکر میں خود خدا ہی ہو۔ یہ مفہوم و مضمون عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ لیکن اس سے یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ایک ایسا بھی مرتبہ ہے جو کشف و یقین اور معرفت و دین سے بھی بلند ہے۔ عام لوگ کشف و معرفت کو تو کیا سمجھیں اور کیا قدر کریں اتنا البتہ سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی ایسی بھی صورت ممکن ہے جب دین کی بھی ضرورت و اہمیت باقی نہ رہے۔ بس دین و مذہب اور احکام خدا و رسولؐ سے غافل کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے۔ اور پھر جب اس کی تائید و تاکید اور تشریح و تصریح کے لئے خواجہ حافظ شیرازی کا کلام سحر نظام ہو اور اتنی کثرت سے ہو،

ایسا مطبوع و مقبول ہو تو کیا تعجب ہے کہ خلق خدا کا سر پھر جائے اور دماغ الٹ جائے۔ حافظ کے کلام میں دین و مذہب، شیخ و واعظ، صلاح و تقویٰ کا طعن و استخفاف اور رندی و عاشقی، عیش و نشاط، نغمہ و سرود، ترک عمل و بیخودی، رسوائی و بدنامی کی تحسین و تشویق معلوم و مشہور ہے۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے دیکھئے :-

چہ نسبت ست بہ رندی صلاح و تقویٰ را
سماع وعظ کجا نغمۂ رباب کجا

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز بازخواست
نان حلال شیخ ز آب حرام ما

تو و تسبیح و مصلّٰے و رہِ زہد و ورع
من و میخانہ و ناقوس و رہِ دیر و کنشت

روزہا رفت کہ دست من مسکیں نہ گرفت
ساق شمشاد قدے۔ ساعد سیم اندامے

مے خوارہ و سرگشتہ و رندیم و نظر باز
واں کس کہ چو ما نیست درین شہر کدام است

مے دوسالہ و معشوق چار دہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اے نازنیں پسر تو چہ مذہب گرفتۂ
کت خون ما حلال تر از شیر مادر است

ز زرت کنند زیور۔ بزرت کشند در بہ
من بے نوائے مضطر چہ کنم کہ زر ندارم

بشنو این نکتہ کہ خود را ز غم آزادہ کنی
خوں خوری گر طلب روزی ننہادہ کنی
آخر الامر گلِ کوزہ گراں خواہی بود
حالیا فکر سبو کن کہ پر از بادہ کنی
جہد بنما کہ در ایامِ گل و عہدِ شباب
عیش با آدمیِ چند پری زادہ کنی

یہ اشعار جو اوپر لکھے گئے۔ کلام حافظ میں یکے از ہزار کی نسبت رکھتے ہیں۔ ان کا مفہوم جو حافظ کو مقصود ہو وہ حافظ جانیں۔ لیکن اگر ان الفاظ و مضامین کے لغوی و ظاہری معنی نہ لئے جائیں بلکہ مجازی معنی و صوفیانہ تعبیر سے کام لیا جائے تو اسکو صرف اہل باطن و ارباب معرفت سمجھ سکتے ہیں۔ صرف اہل اللہ یہ تعبیر کر سکتے ہیں

کہ "روزی نہ نہادہ" (جو قسمت میں لکھی نہ ہو) کی طلب نہ کرنے سے مراد توکل علی اللہ ہے جو سعیِ اسباب کے بعد اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں موت کو یاد دلا کر سبوے دل کو بادہ معرفت سے بھرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں "آدمی چند پری زادہ" سے مقصود پیرانِ سلسلہ یا یاران طریقت ہیں اور ان کی یاد و صحبت کو عیش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن عوام الناس یہ ظرف اور یہ فہم نہیں رکھتے۔ ان پہ یہی اثر پڑیگا اور پڑا ہے کہ جب تقدیر پہ معاملہ ٹھہرا تو سعی و محنت سے کیا حاصل بخت و اتفاق پہ چھوڑو۔ جتنی مقدر میں ہے مل رہے گی۔ آخر کار یہ زندگی ختم ہونی ہی ہے، پھر جو وقت اپنے ہاتھ میں ہے اس کو عیش و نشاط اور رندی و مستی میں کیوں نہ صرف کیا جائے کہ ہوش نہ ہونگے تو غم بھی نہ ہوگا۔ عہد شباب اور ایام گل ناپائدار ہیں، چند روزہ ہیں۔ جہاں تک بس چلے معشوقوں کی صحبت میں زندگی گذار دو۔

چنانچہ تمام دنیاے اسلام میں عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و طبائع پہ یہی نقوش جم گئے۔ اور بیدلی، بے عملی، بے ہمتی، دوں فطرتی پیدا ہو گئی۔ اس حالت کے پیدا کرنے کے ذمہ دار صرف افلاطون اور خواجہ حافظ نہیں ہیں جنکا نام اقبال نے لیا ہے، بلکہ سلاطین و امرار، علماء و صوفیاء، مبلغین و واعظین، شعراء و مصنفین، سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ نظامی و خسرو، سعدی و جامی سب نے وہ لکھا ہے جو حافظ نے لکھا۔ لیکن اور سب نے صرف یہی نہیں لکھا اسکے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہے اور دوسرے موضوعات و مضامین میں ان کے ایسے مضامین ایک دفعہ کو گم اور غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن حافظ نے صرف

یہی لکھا ہے اور کچھ نہیں لکھا، سب سے زیادہ لکھا ہے اور سب سے بہتر و شیریں تر۔ سب سے زیادہ مقبول ہوا ہے اور سب سے زیادہ اثر انداز۔ اس لئے اگر تمام شاعروں میں سے اس بحث کے اندر کسی ایک فرد کا نام انتخاب کیا جائے گا تو وہ بلاشبہہ حافظ کا نام ہوگا۔ اس بنا پر اگر اقبال نے اِس سلسلہ میں حافظ کا نام لیا تو ہرگز قابل الزام بھی نہیں چہ جائیکہ مستوجب فتوائے کفر ہو۔

کلام حافظ کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک مضمون مطبوعہ ساقی میں مولانا حالی کی رائے لکھتے ہیں کہ "بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشقبازی، بدنامی اور رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے"۔ ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں یہ حوالہ بھی دیتے ہیں۔ کہ شیر خاں لودی نے جو امرائے عالمگیر میں سے تھا اپنی کتاب مرآت الخیال میں لکھا ہے:۔

"حضرت عالمگیر شاہ در اوائل ایام سلطنت حکم کردہ بود کہ دیوان خواجہ حافظ شیرازی را مردم از کتاب خانہ ہائے خود بر آرند و معلمان ممالک محروسہ بہ صبیان تعلیم نہ نمایند"۔

یعنی عالمگیر بادشاہ نے دیوان حافظ کا رکھنا اور پڑھانا ممنوع قرار دیدیا تھا۔

حافظ کے یہ مضامین جنکا اقبال نے حوالہ دیا اور میں نے مثالیں لکھیں یقیناً محل نظر اور قابل بحث ہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ حافظ نے اپنے زمانے کے صوفیان کرام کے جو معتقدات و معمولات بیان کئے ہیں، اور جو آجتک

تمام عالم اسلامی اور ہندوستان کے شیوخِ طریقت میں مقبول و رائج ہیں، وہ بھی لائق نقد و نظر ہیں اور حضرت مجدّد الف ثانی سرہندی قدس سرہ العزیز نے ان پر بحث کی ہے اور اپنے طریقہ سے ان کو خارج کر دیا ہے۔

مثلاً "سماع نغمہ" کا تذکرہ حافظ کے کلام میں شراب و شاہد سے دوسرے نمبر پہ ہے۔ "مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما" "مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بنو"

یار ما چوں ساز د آہنگ سماع ۔ قدسیاں در عرش دست افشاں کنند

یہ سماع آج کسقدر رائج ہے۔ لیکن حضرت مجدد صاحب کے نزدیک یہ شغل نا محمود ہے۔

تجرید (ترک دنیا) کی حافظ تبلیغ کرتے ہیں:۔

نور خدا نمایدت آئینۂ مجردی

از در ما در آ اگر طالب عشق سرمدی

یعنی اگر تو عشق سرمدی کا طالب ہے تو ہمارے پاس آ۔ ہم تجھکو تجرید سکھائینگے، اور آئینہ مجردی (تجرید) میں تجھے نور خدا نظر آجائے گا۔ لیکن حضرت مجدّد صاحب نور خدا کو دیکھنے کے لئے تجرید کو لازم نہیں سمجھتے۔ ان کے طریقہ میں ترک دنیا ہی سے نہیں بلکہ دنیا کے اندر رہ کر، دنیا کو اختیار کر کے بھی نور خدا اور عشق سرمدی حاصل ہو سکتا ہے۔

چلہ کشی صوفیوں کا مشہور طریقہ ہے۔ خواجہ حافظ شاعرانہ و رندانہ انداز میں اس کی ترغیب دیتے ہیں:۔

سحرگہ رہروے در سرزمینے
ہمیں گفت ایں معمّا با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینے

یعنی شراب کو صاف کرنا ہو تو چالیس روز (اربعین) شیشے میں رکھو۔ مقصود یہ کہ چلّہ کھینچنے سے دل میں صفائی آتی ہے۔ لیکن حضرت مجدّد صاحب نے تصوف کو آسان کر دیا ہے۔ چلّہ نشینی، فاقہ کشی، ترک حیوانات، اشغال مالایطاق، مجاہدات طاقت آزما، بلاشبہہ اپنے اپنے اثرات و فوائد میں سود مند و کارگر ہیں۔ ان پہ عمل کر کے سالکانِ راہِ خدا نے بڑی منزلیں طے کی ہیں اور بڑے مراتب حاصل کیے ہیں۔ لیکن اول تو تصفیۂ قلب، تزکیۂ روح، عشق خدا و رسولؐ اور وصول الی اللہ کے لئے صرف یہی ذریعہ نہ تھا۔ دوسرے وسائل و ذرائع بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان ریاضات شاقّہ اور مجاہدات دشوار سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت اہل زمانہ میں باقی نہ رہی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ مختلف سلسلوں کے لاکھوں متوسّلین ان معمولات و مشاغل سے قاصر رہنے لگے تھے اور مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکے پر قناعت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس حالت میں طریقت و تصوف کا فائدہ بہت کم پہنچتا تھا اور اصلی غرض ہی فوت ہو جاتی تھی۔ وہ زمانہ آگیا تھا کہ سید ھی سی نماز اور سیدھا سادہ روزہ دلوں پہ گراں تھا۔ مجاہدے اور ریاضتیں کیونکر ہوتیں۔ اعزّہ و اقارب کے ساتھ معاملات میں خلوص و صفائی کا وجود نہ رہا تھا۔ قوم و ملک اور خلق اللہ کا کیا ذکر۔ بہب

یہ تھا کہ عبادات و معاملات میں خلوص و للّٰہیت کا انحصار ہے قلب و روح کی صفائی و پاکیزگی پر اور اس کا انحصار ٹھہرا مجاہدات و ریاضات پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ریاضتیں رہیں نہ صفائے قلب و روح۔ نہ خلوص معاملات و عبادات۔ اس کیفیت کو دیکھ کر حضرت مجدّد الف ثانی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے سلوک کے اس طریقے (نقشبندیہ مجدّدیہ) کو رواج دیا جس سے سخت و صعب مجاہدات کے بغیر تصفیۂ قلب و تزکیۂ روح اور خلوص عبادات و صفائے معاملات حاصل ہو سکے۔ اور اس طرح معرفت الٰہی تک پہنچنے کا چھوٹا سے چھوٹا اور آسان سے آسان راستہ نکال دیا۔

بہر حال خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک و تعلیم پر نقد و نظر کرنے میں حضرت مجدّد الف ثانی امام ربانی قدس سرہ العزیز بھی علّامہ اقبال مرحوم کے ساتھ ہیں۔

میری رائے حافظ و کلام حافظ کے متعلق یہ ہے کہ حافظ کی بزرگی و پاکدامنی میں کوئی شک نہیں۔ حافظ کے کسی ہم عصر یا قریب العصر مورّخ و مصنف نے ان کی رندی و عشقبازی کی شہادت نہیں دی۔ صرف ایک "مفتاح التواریخ" میں ایک دو واقعات حافظ کی شراب خواری کے لکھے ہیں۔ لیکن وہ صدہا سال بعد کی تصنیف ہے اور تاریخ کی نہیں بلکہ لطائف تاریخی کی کتاب ہے۔ اس لئے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ علامہ شبلی کا یہ خیال کہ "خواجہ حافظ پر رندی و سرمستی کا جذبہ غالب تھا" صرف ان کا قیاس ہے جو کلام حافظ پر قائم کیا گیا ہے۔ خواجہ حافظ کا رندی و عاشقی کے مضامین لکھنا

کچھ عجیب و جدید بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے اور بعد کس نے کیا نہیں لکھا۔ خسرو، سعدی، جامی وغیرہ بہت سے مسلّم بزرگ و اولیاء اللہ ہیں جو شاعر بھی تھے۔ اپنے زمانے کی رفتار شاعری کے ساتھ سب چلے ہیں۔ لیکن کسی نے خسرو و جامی کے متعلق یہ بحث نہیں اٹھائی۔ ہمارے سامنے اُردو کے شاعروں کی مثالیں موجود ہیں۔ مرزا مظہر جانجاں، خواجہ میر درد، امیر مینائی، شاہ عبدالعلیم آسی غازیپوری وغیرہ مانے ہوئے پاک باطن، متقی، پرہیزگار اصحاب طریقت تھے۔ لیکن ان سب نے کیا کیا ناگفتنی و ناشنیدنی نہیں کہا ہے۔ داغ و ریاض کی خمریات مشہور ہی ہیں۔ ریاض نے تو کمال کر دیا ہے کہ فارسی اُردو کے تمام شاعروں میں شاید حافظ کے مقابلے میں ریاض کا دوسرا نمبر رہے ورنہ اور سب سے اوّل ہیں۔ لیکن آج لوگ قسم کھانے اور قرآن اٹھانے کو تیار ہیں کہ ریاض نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

مست مے کر دیا جہاں بھر کو خود لگایا نہ منہ سے ساغر کو (جلیل)

شاعروں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ یقولون مالا یفعلون کے مصداق ہیں جہاں اچھی باتیں کہتے ہیں اور خود ان پر عمل نہیں کرتے، وہاں بری باتیں بھی ایسی لکھ دیتے ہیں جو ان کی معمولات نہیں ہوتیں۔ اور اپنی شاعرانہ فطرت و عادت سے پڑھنے والوں کو عجیب عجیب دھوکے دیتے ہیں۔ مثلاً ریاض خیرآبادی کہتے ہیں:-

گناہ کوئی نہ کرتے۔ شراب ہی پیتے
یہ کیا کیا کہ گنہ سب کئے شراب نہ پی

اس پر کچھ لوگ تو کہیں گے کہ غلط کہا۔ شراب بھی پی اور گناہ بھی سب کیے۔ اور بعض آدمی کہیں گے کہ جب سارے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تو بیشک شراب نہ پی ہوگی۔ ورنہ ضرور اس کا بھی اقرار کرتے۔ لیکن ثقہ گواہوں کی زبانی واقعہ یہ ہے کہ ریاضؔ عشقبازی سے بھی عمر بھر ایسے ہی پاک رہے جیسے شراب خواری سے۔ کہیے اب کیا کہا جائے۔

یہی کیفیت خواجہ حافظ کی سمجھیے۔ ان کے زمانے میں شراب و شاہد ایران میں لازمۂ زندگی سہی، لیکن یہ نہ تھا کہ سب مبتلا ہوں۔ ہزاروں لاکھوں محفوظ بھی تھے۔ ان میں حافظ بھی ہو سکتے ہیں اور بلاشبہ تھے۔ ان کے کلام میں بعض پوری غزلیں اور صدہا اشعار یقیناً ایسے ہیں جن میں خالص صوفیانہ مضامین ہیں۔ اور صدہا ایسے جن میں شاہد و شراب سے حقیقت و معرفت کی طرف اشارہ ہے۔ یہی ان کے ذاتی واردات ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں کہ بڑی کثرت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں صاف صاف رندی و ہوسناکی کے جذبات و حالات ہیں۔ یہ محض تقلیدی و رواجی ہیں۔ سب کہتے تھے۔ انھوں نے بھی کہدئے۔ شوخ مزاج و خوش طبع آدمی تھے اسلئے اوروں سے زیادہ کہے۔ اور زیادہ شوخ کہے۔ ہمارے ہاں کے پاکباز و پرہیزگار شاعر ریاضؔ نے حافظ سے شوخ تر کہا ہے۔ مثلاً حافظ کہتے ہیں:

روزِ ہا رفت کہ دستِ منِ مسکیں نگرفت
ساقِ شمشاد قدے۔ ساعدِ سیم اندامے

لیکن ریاضؔ خیرآبادی اس بارے میں یہ مشورہ دیتے ہیں:

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں۔ گود میں جھپکے سے اٹھالے

مضمون ایک نہیں ہے۔ صرف عشقبازی و ہوسناکی کو دیکھئے۔ حافظ کہتے ہیں:۔

سہ بوسہ کز دو لبت کردۂ وظیفۂ من
اگر ادا نکنی دام دار من باشی

بداں ہوس کہ بہ بوسم بمستی آں لب لعل
چہ خوں کہ در دلم افتاد ہمچو جام و نشد

امیرؔ مینائی کی شوخی دیکھئے۔

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے اجازت کیسی

اور ریاضؔ نے تو انتہا کر دی:۔

یہ سن کے وصل میں میری تو جان سوکھ گئی
چلو۔ ہٹو بھی۔ ہماری زبان سوکھ گئی

پھر جب امیرؔ و ریاضؔ کی زندگی بے لوث تھی تو حافظ پاک دامن کیوں نہ ہوں۔ تھے اور بیشک تھے۔ ان کے اس طرح کے اشعار صرف شاعرانہ لطائف ہیں۔

مسند بگلستاں بر تا شاہد و ساقی را
لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

فردا شراب کوثر و حور از برائے ماست
وامروز نیز دلبر مہر وے و جام مے

امید از بخت میدارم کہ بکشایم کمر بندت
بآں شرطے کہ خاطر از منِ مسکیں نرنجانی

بکشا بند قبا تا بکشاید دل من
کہ کشادے کہ مرا بود ز پہلوے تو بود

ساقی سیم ساق من گر ہمہ زہر می دہد
کیست کہ تن چو جام مے جملہ دہن نمی کند

از شرم در حجابم ۔ ساقی تلطفے کن
باشد کہ بوسہ چند بر آں دہاں تواں زد

نگارم دوش در مجلس بعزم رقص چوں برخاست
گرہ بکشود از گیسو و بر دل ہای یاراں زد

زاں مے صاف کزو پختہ شود ہر خامے
گرچہ ماہ رمضان است بیاور جامے

خدائے پیرہن چاک ماہ رویاں باد
ہزار جامۂ تقوےٰ و خرقۂ پرہیز

گر شوند آگہ از اندیشۂ ما مغبچگاں
بعد ازیں خرقۂ صوفی بگرو ننستانند

محض ان اشعار کی بنا پر حافظ کو رند و بوالہوس نہیں کہہ سکتے۔ زندہ دل شاعر کہنا چاہیے۔ خوش فکر و بذلہ سنج کہنا چاہیے۔ اوپر کا آخری شعر کس قدر خوش اسلوب ہے۔ کس قدر حسن و لطافت کے ساتھ مضمون ادا کیا ہے۔ یعنی صاف طور پر نہیں کہتے کہ شرابخانہ کے نوخیز لڑکوں کے پاس کس خیال اور ارادے سے بار بار جاتے ہیں اور خرقہ گروی رکھتے ہیں۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ارادہ و خیال سے مغبچے آگاہ ہو جائیں تو پھر کبھی ہمارا خرقہ بھی گروی نہ رکھیں۔ مطلب یہ کہ ہماری نیت بد ہے۔ ہم صرف خرقہ کو گروی رکھ کر شراب پینے نہیں جاتے بلکہ ان مغبچوں کا دیدار و لطف صحبت اور ان سے عشقبازی بھی مقصود ہے۔ لیکن وہ اس سے بیخبر ہیں۔ گویا وہ لوگ حافظ کا عندیہ پالیں تو پھر ان کا وہی حال کریں جو مرزا غالب اپنا حال پاسبان یار کے ہاتھوں اس شعر

میں بیان کرتے ہیں:۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا۔ مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

ادھر ہوسناکی و نظربازی کا اقرار ایسی بیباکی سے ہے، اور ادھر بڑے زور کے ساتھ اپنی پرہیزگاری کا دعویٰ اور اعلان کرتے ہیں:۔

منم کہ شہرہ شہرم بعشق ورزیدن
منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن[1]

اسی طرح شرابخواری سے اپنی پاکدامنی بیان کرتے ہیں:۔

در حق من بدرد کشی ظن بد مبر
کالودہ گشت خرقہ ولے پاکدامنم[2]

بلاشبہہ یہ دعوے حقیقت ہیں اور وہ دعوے اور اقرار یا استعارے اور کنایے ہیں معرفت کیلئے۔ یا فقط شاعرانہ رسم پرستی و تقلید۔ اگرچہ معرفت کے استعارہ و کنایہ

---

[1] یہ شعر میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مضمون میں دیکھا تھا۔ پھر دیوان حافظ میں دیکھا۔ [2] یہ شعر مجھے لڑکپن سے یاد ہے۔ اس لئے کہ اس شعر سے ایک واقعہ کی فال نکالی گئی تھی۔ چالیس سال سے کم نہ ہوئے ہونگے کہ ایک مرتبہ میرے حقیقی ماموں صاحب کے متعلق یکایک یہ معلوم ہوا کہ انکا دفعۃً انتقال ہوگیا۔ وہ اس وقت وطن سے باہر تھے۔ اس پریشانی میں میرے والد صاحب نے دیوان حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا۔ انکو ایسا اعتقاد تھا کہ فال نکلنے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہوگئے۔ لیکن ہملوگ اسوقت تک پریشان رہے جبتک اس افواہ کی تکذیب ہوگئی اور خود ماموں صاحب واپس نہ آگئے۔

کے متعلق خواجہ صاحب کا یہ دعوے ہے:۔

شعرِ حافظ ہمہ بیت الغزل معرفت است
آفریں بر نفس دلکش ولطف سخنش

لیکن اس دعوے کی جامعیت محلِ نظر ہے ۔ تمام اشعار معرفت پہ صادق نہیں آسکتے ۔ اگر خوش اعتقاد شارحین حافظ کے "معشوق چاردہ سالہ"، "ساقی سیم ساق" "نازنیں پسر"۔ "شیریں پسر"۔ "دلبر شاہد وطفل"۔ "مغبچگاں"۔ "آدمی چند پری زادہ" "لولی دروغ وعدہ وقتال وضع ورنگ آمیز"۔ اور رندی وہوسناکی کے ناقابلِ تاویل مضامین سے خدا ۔ رسولؐ ۔ پیر و مرشد اور طریقت ومعرفت مراد لیتے ہیں تو وہ بلاشبہ شاعری، غزل گوئی، اور سخن فہمی سے اپنی ناواقفیت بلکہ بدمذاقی کا ثبوت دیتے ہیں ۔ یقیناً ایسے اشعار بکثرت موجود ہیں جن میں تاویل کی گنجائش نہیں یا جنکے الفاظ ایسے ہیں کہ خدا ورسول ومرشد کی طرف انکی تاویل نہایت مکروہ اور خلاف ادب و احترام ہے ۔ ان سے حقیقت کی بجائے مجاز مراد لینا زیادہ مناسب ہے ۔ مثلاً خواجہ حافظ کی ایک غزل کے اس قطعہ کو دیکھئے:۔

شب قدرے چنیں عزیز و شریف
با تو تا روز خفتنم ہوس است
وہ کہ دُر دانۂ چنیں نازک
در شبِ تار سفتنم ہوس است

فرماتے ہیں کہ "ایسی عزیز و شریف شب قدر میں مجھے تیرے ساتھ صبح تک سونے کی ہوس ہے اور ایسے نازک گوہر کو اندھیری رات میں پرونے کی

تمنا ہے"۔ اب جس کا جی چاہے اس سے یاد الٰہی اور اسرار و انوارِ معرفت مراد لے لے، لیکن اتنا تو سوچنا چاہیے کہ ایسے پاکیزہ جذبات کیلئے کیا یہ ناپاک پیرایہ ہی رہ گیا تھا۔ نہیں حقیقت وہی ہے جو میں نے اوپر لکھی اور جسکو خود خواجہ صاحب اس غزل کے مقطع میں بیان کرتے ہیں:۔

ہمچو حافظ بر غم مدعیاں   شعرِ رندانہ گفتنم ہوس است

اگر سمجھیے تو "شعر رندانہ گفتن" کوئی عیب نہیں بقول حافظ:۔

باز گویم نہ دریں واقعہ حافظ تنہاست

غرقہ گشتند دریں بادیہ بسیار دگر

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے مضمون (محولہ بالا) میں خواجہ حافظ کی شراب نوشی کے ثبوت میں لکھتے ہیں کہ شیراز کا بادشاہ ابواسحٰق عیش پرست تھا۔ اس لئے میخواری و شاہد پرستی عام تھی۔ اس کے بعد امیر مبارز الدین بادشاہ ہوا۔ یہ بڑا کٹر دیندار تھا۔ اس نے شراب خانے بند کرا دیے اور محتسب مقرر کر دیے۔ اب لوگ چھپ چھپ کر پیتے تھے۔ اور بادشاہ کو کوستے تھے۔ خواجہ حافظ نے بھی بار ہا اور جا بجا اس کا ماتم کیا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع تخت نشیں ہوا تو اس نے پھر شرابخانے کھلوا دیے۔ میخواروں کی عید ہو گئی۔ خواجہ صاحب کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ غزلوں پہ غزلیں لکھتے ہیں۔ بادشاہ کی تعریفیں کرتے ہیں اور اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بقول شیخ سعدیؒ "در ایام جوانی چنانکہ اُفتد دانی" اگر خواجہ صاحب کو شراب و شاہد سے دلچسپی رہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں اس دور کی سوسائٹی

میں لازمہ زندگی ہو گئی تھیں۔" لیکن اس کے بعد ڈاکٹر صاحب خواجہ حافظ کے دعویٰ پاکدامنی کو بے چون وچرا تسلیم کرتے ہیں۔

میری رائے میں ڈاکٹر صاحب نے جس "دلچسپی" کا قیاس کیا ہے وہ واقعہ نہیں ہے۔ شیراز میں بیشک شراب خواری وشاہد پرستی رائج تھی۔ اور بادشاہوں کی طبیعتوں کے اختلاف سے اس پر اثر پڑتا تھا۔ رعایا کبھی کوستی تھی، کبھی دعائیں دیتی تھی اور خواجہ حافظ بادشاہوں اور وزیروں کے نام لے لے کر غزلیں اور مضامین لکھتے تھے۔ لیکن یہ سب اہل شیراز کا حال اور خواجہ حافظ کا قال تھا۔ شاعر اپنے اوپر ڈھال کر کہا کرتا ہے۔ جس طرح "حدیث دیگراں" میں "سرِّ دلبراں" خوشتر ہوتا ہے اسی طرح

در حدیث خویش سرِّ دیگراں

اقبال و مقام اقبال

اہل ایران کی نظر میں

از

پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایم اے

آقائے پور داؤد نے ایرانی ثقافتی وفد کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے ایک بیان میں علامہ اقبال کے متعلق اظہار خیال کیا تھا اور ڈاکٹر ٹیگور کی شاعری کو آفاقی بیان کر کے کہا تھا کہ ایران میں ٹیگور کا نام گلی گلی میں ہر کہ و مہ جانتا ہے۔ مگر اقبال کو معدودے چند افراد سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

پور داؤد کے اس بیان سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں آگ لگ گئی اسکڑوں بیانات اس کی تردید میں شائع ہوئے اور جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے پور داؤد کی اس متعصبانہ تنگ نظری پر احتجاج کیا گیا۔ چند ہی روز کے بعد ایرانی ثقافتی وفد کے قائد ہز ایکسیلنسی آقائے علی اصغر حکمت نے لاہور میں ۱۵ مارچ ۱۹۴۴ء کو ایک اخباری نمائندے کو جواب دیتے ہوئے پور داؤد کے اس بیان کی تردید کی کہ علامہ اقبال کو ایران میں کافی شہرت حاصل نہیں ہے اور یہ فرمایا کہ "اس کے برعکس اقبال کا پیغام تمام دنیا کے لئے تھا اور ملت ایران اقبال کو اپنا شاعر سمجھتی ہے، اقبال نے ایران کی زبان میں لکھا ہے اور ان کے پیغام کا تخاطب خاص طور پر مشرق کی تمام اقوام سے ہے"۔

آقائے پور داؤد کچھ عرصہ شانتی نکیتن میں مشرقی تمدن کے لکچرار کی

حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ وہاں کی جادو اثر فضا، دلفریب مناظر، توبہ شکن ماحول نے ان پر پورا پورا اثر کیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا تصوری آفاقیت اور خیالی دنیا میں کھو جانا بے محل نہیں، اور ٹیگور کو اقبال پر ترجیح دینا حق نمک ادا کرنا ہے پھر بھی نہیں، بلکہ پورداؤد ان ایرانیوں میں ہیں جن پر وطینت کا جنون مسلط ہے۔ اور ہر غیر ملکی شئے کو نظر استخفاف سے دیکھنا ان کا دین و ایمان ہے۔ فارسی زبان میں سے عربی الفاظ، محاورات، استعارات وغیرہ کو خارج کرنا، اپنے چہاردہ صد سالہ تمدن و معاشرت سے اسلامی اثرات کو محو کرنا، اور حد یہ کہ مذہب اسلام تک سے گریز، نفرت اور فرار اختیار کرنا پورداؤد کا مقصد زندگی ہے۔ اور دلیل یہ کہ یہ سب چیزیں دیسی نہیں بدیسی ہیں۔ ایرانی نہیں عربی ہیں۔ اسی لئے ہر وہ شئے جو اسلامی کہی جاسکے، ان کی نظر میں قابل ملامت قرار پاتی ہے۔ اور اسی سبب سے زرتشت اور تعلیم زرتشت کی طرف بازگشت پورداؤد جیسے ایرانیوں کے نزدیک قومی لائحۂ عمل میں شامل ہوتی جاتی ہے۔

ان صاحبوں کا یہ زاویۂ نگاہ ہے اور اقبال کا یہ نظریہ کہ انھوں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے متعلق بھی صاف کہدیا تھا:۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں۔ ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بیخبر ز مقام محمد عربی ست

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسی ۔ دیں تمام بولہبی ست

لیکن باوجود اس نقطۂ نظر کے، اقبال کا پیام اپنی روح میں محدود نہیں، بلکہ تمام عالم کے لئے ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو رسالہ اس ڈی کے "اقبال نمبر" میں

لکھتے ہیں :-

"اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک "ملٹن" کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا، یا "کالیداس" کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا، اس کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ اور مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی۔"

روزنامہ "اصلاح" کابل نے اقبال کی وفات پر جو طویل مضمون شائع کیا تھا اس میں سے چند جملے یہ ہیں :-

"اگرچہ علامہ اقبال سرزمین ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن آپ کا علمی مقام آپ کی اخلاقی اور فلسفی تعلیمات و تلقینات آپ کو جامع بشری کا ایک جلیل القدر فرد قرار دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ عالم اسلام اور مشرق کے لئے نابغہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ان منور الفکر اور بلند پایہ فلاسفروں میں سے تھے جو سارے کرۂ ارض کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔ اور عالم بشریت کو ایک ملت سمجھتے ہیں۔ اس امر میں کسی کو اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر اقبال زمانۂ حال کے مفکرین، شعراء، ادباء اور اہل فلسفہ میں سب سے ممتاز ہستی کی حیثیت رکھتے تھے۔"

اقبال کی فارسی شاعری کے متعلق بھی یہ شہادت قابل توجہ ہے کہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اپنے ایک طویل بیان میں فرماتے ہیں :-

"میں یہ کہنے کی ضرور جرأت کروں گا کہ میں بعض ایرانی اُدبا و فضلا سے یورپ اور دیگر مقامات پہ ملا ہوں۔ ان سب نے اقبال کی فارسی زبان پر قدرت کاملہ کی بہترین الفاظ میں مدح سرائی کی ہے۔ پروفیسر براؤن نے بھی جو فارسی زبان کے بہت بڑے فاضل تھے اور جو ہندوستانی شعراء کی لکھی ہوئی فارسی کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے، مجھ سے ایک بار کیمبرج میں فارسی زبان کے شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کی شاندار الفاظ میں تعریف و توصیف کی"۔

اب اقبال کی زندگی، شاعری، پیام اور مقبولیت کے متعلق ایران جدید کے چند اور ممتاز اہل علم و فضل کی تصدیق ملاحظہ ہو۔

اقبال کی وفات (اپریل ۱۹۳۸ء) سے دس سال قبل اپریل ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد (دکن) جامعۂ معارف حیدر آباد کے ایک جلسے میں داعی الاسلام آقائے سید محمد علی پروفیسر فارسی نظام کالج نے اقبال کی فارسی تصنیفات پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ ان کے مقالہ کے بعض حصوں کا ترجمہ ذیل میں اقتباس کر کے درج کرتا ہوں:۔

آقائے محمد علی فرماتے ہیں کہ اقبال کے فارسی نغموں کی شہرت تمام ایشیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان کو "طوطی شکر شکن" اور "بلبل شیراز" کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ اقبال کے کلام پہ غالب کے رنگ کا اثر ہے۔ ہندوستان میں نصف صدی قبل غالب فارسی کا بہترین شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ میں کہتا ہوں کہ غالب کے بعد ہندوستان کی آنکھیں اقبال نے روشن کی ہیں۔ کسی قدیم نقاد نے استادوں کی جانشینی کا مسئلہ اس شعر پہ ختم کیا تھا:۔

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید
بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر یہ اضافہ فرمایا:۔

زجامی و عرفی بہ طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

اب میں اس مضمون پر یہ اضافہ پیش کرتا ہوں:۔

چو غالب زہندوستاں رخت بست
بجائے وے اقبال دانا نشست
یقیں داں سخن دانی پاستاں
بماند بہ ہندوستاں جاوداں

اس کے بعد آقائے موصوف لکھتے ہیں کہ اقبال کی قومی و ملکی نظمیں ایران کے شعرائے عصر حاضر عارف قزوینی اور بہار مشہدی کی وطنی نظموں کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہیں۔ میری رائے ہے کہ اگر اقبال ایران میں پیدا ہوئے ہوتے اور فارسی میں وطنی نظمیں لکھتے تو ایران کے اساتذۂ سخن کی صف اوّل میں ان کی جگہ ہوتی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ میرے دل پر اقبال کی اردو قومی نظموں کا جس قدر اثر ہوا، اتنا ایران کے شعرائے جدید کے کلام کا نہیں ہوا۔"

اس تمہید کے بعد آقائے داعی الاسلام نے اقبال کی پہلی فارسی تصنیف "اسرار خودی" پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے موضوع اور ترتیب مضامین کو بیان

کیا ہے۔ "اسرار خودی" کے مختلف مقامات سے نمونے دیئے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی کی ایک حکایت کے مقابلے میں "اسرار خودی" سے حکایت نوجوانی ازمرد کہ پیش علی ہجویری آمد پیش کر کے دونوں کا اسلوب بتایا ہے۔ "اسرار خودی" کے طرز بیان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اگرچہ آج کل کے ایرانی شعراء اسکو "اسلوب ہندی" کہتے ہیں۔ لیکن یہ طرز ادا ہندوستان کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ عہد متوسطین میں ایران کے شعراء کا بھی اسلوب شعر یہی تھا۔ پھر متاخرین نے اپنا طرز بدل دیا۔ اور متوسطین کی بلاغت اور اظہار علم و فضل کے شوق کو ترک کر کے صاف و واضح لکھنے لگے۔ لیکن اقبال نے اپنی مثنویاں عوام کیلئے نہیں بلکہ خواص کیلئے لکھی ہیں۔ اگرچہ اقبال کا پیام تمام مسلمانوں کے لئے ہے۔ لیکن انھوں نے اپنا مخاطب علماء و حکماء ملت کو بنایا ہے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغربی تہذیب یافتہ طبقہ کو چنانچہ اُن لوگوں میں اسرار خودی نہایت مقبول ہوئی۔ اگر اقبال آسان و سلیس اور عام فہم زبان میں لکھتے تو عوام اور زاہدانِ خشک ان پر کفر کے فتوے لگا دیتے۔"

اسرار خودی اور رموز بیخودی دونوں کی فارسی زبان کے متعلق آقائے محمد علی ایرانی کی یہ رائے ہے کہ "اقبال کی فارسی ایران کی فارسی سے کچھ زیادہ متغائر نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بعض عربی و فارسی الفاظ اردو میں جن معنوں کے لئے مستعمل ہیں اور ایران میں ان کا وہ مفہوم نہیں ہے ان الفاظ کو اقبال نے ہندوستانی رواج کے مطابق استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ بات کہیں کہیں اور خاص خاص الفاظ میں ہے۔ باقی زبان وہی ہے جو ایران میں مستعمل ہے۔"

آقائے محمد علی نے رموز بیخودی کے موضوع و مضمون اور ترتیب کی بھی

تشریح کی ہے، اور "اتحاد اسلامی" (پان اسلام ازم) پہ بڑی بحث کی ہے۔ انھوں نے رموز بیخودی کے بھی نمونے درج کئے ہیں۔ اور ان کی تعریف کی ہے۔ پھر اقبال کی تیسری کتاب پیام مشرق پہ اسی طرح تبصرہ کیا ہے۔ اس کی زبان کے متعلق کہتے ہیں کہ "اسرار و رموز کے مقابلے میں پیام مشرق کی زبان واضح تر و شیریں تر ہے۔ اور اس کا اسلوب شعر متاخرین شعرائے ایران سے بہت مشابہ ہے"۔ "پیام مشرق" کی تمام حصوں (لالۂ طور، مے باقی، نقش فرنگ وغیرہ) سے نمونے پیش کئے ہیں۔

آخر میں اقبال کی چوتھی تصنیف زبور عجم پہ نقد و نظر ہے۔ اور اس کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ "زبور عجم کی غزلیات زبان و بیان میں" پیام مشرق" کی غزلوں سے بھی بہتر ہیں۔ اور مولانا روم کی غزلوں کے ہم پلہ ہیں"۔ اس کے بھی مختصر نمونے درج کئے ہیں۔

اس فاضل ایران کے یہ تبصرے اور یہ رائیں اقبال کی فارسی کے لئے بڑی سند ہیں اور اس کی سعی و کاوش، وسعت نظر اور ذوق سلیم کے لئے شاہد عادل ہیں۔ عصر حاضر کے مسلمانان ہند کو قدیم فارسی سے بھی (جس میں ان کی تاریخ، تہذیب، مذہب، کلچر سب کچھ بھرا پڑا ہے) برائے نام ربط و تعلق رہ گیا ہے۔ ایران کی جدید فارسی سے اتنا بھی نہیں۔ اس حالت میں اقبال لاہور میں بیٹھ کر فارسی میں شاعری کرتے اور کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کو اپنے نصب العین، موضوع تصنیف اور پیغام شاعرانہ کے لئے نہ متاخرین ایران قاآنی و نشاط و عندلیب سے کچھ واسطہ نہ معاصرین عارف و بہار و اشرف سے کچھ بحث۔ لیکن انھوں نے اپنے پیام کو عالمگیر بنانے کے لئے اور اہل زبان کی نظر میں مقبول بنانے کی خاطر

فارسی زبان کو اختیار کیا ہے، اس لیے وہ عالم کی رفتار سیاست و معاشرت اور رجحان و ذہنیت کے ساتھ ساتھ ایران کی رفتار زبان کا بھی بغور مطالعہ کرتے جاتے ہیں۔ اور مذاق صحیح کی رہنمائی سے ایک کے بعد دوسری تصنیف میں نہ صرف موضوع و پیام کے لحاظ سے ارتقا پیدا کرتے جاتے ہیں۔ بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اہل ایران کے محاورہ اور روزمرہ سے قریب تر لاتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر ایک ایرانی بھی کہہ اٹھتا ہے کہ اب ہندوستانی نہیں بلکہ ایرانی بول رہا ہے۔

اس کے بعد ایک اور فاضل گرامی آقائے سعادت علی خاں کے مقالہ "اقبال شاعر و پیام او" (مطبوعہ "روزگار نو" شمارۂ پائینر ۱۹۴۲ء) کا ترجمہ اردو میں ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:-

"جو لوگ اقبال کے کلام کو سمجھتے ہیں وہ اس کے سرچشمۂ اشعار سے حیات و قوت روحانی و معنوی حاصل کرتے ہیں۔ تمام شعرائے جدید میں غالباً اقبال تنہا شاعر ہے جو فساد و بیداد سے جہاد کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اقبال کی روحِ شعر آفریں نے جس سرچشمہ سے آبیاری پائی ہے وہ اسلام ہے۔ اس شاعر نے اسلام کے اصول و اساس کی مدد سے بدی کے ساتھ جنگ کرنے کو اپنا مذہب قرار دیا ہے۔ اور جو لوگ اخلاقی جرأت سے محروم ہونے کے سبب سے یہ جہاد کرنا اور مصائب برداشت کرنا نہیں چاہتے ان کی اقبال نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ مرد کامل کا نمونہ جس کو اقبال نے "مردِ مومنِ مجاہد" کہا ہے، سیدالشہداء کی ذات ہے۔ جیسا کہ کسی حکیم کا قول ہے:-

سر داد و نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ ؎

اقبال کا یہ خیال ہے کہ گیر و دار زندگی کے تمام میدان وسیع میں حسین کی مانند کوئی شخص وجود میں نہیں آیا۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ جو شخص مفاسد کے ساتھ جہاد کرنے پر ایمان رکھتا ہے اس کو حق و عدالت کی خاطر جنگ آزما ہونا لازم و ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ شاعر تمام مصائب و مشکلات زندگانی کا تجربہ رکھتا تھا اس لئے کہ گوشہ نشین آدمی نہ تھا اور اس نے اپنی عمر صرف چند کتابوں کی صحبت میں نہیں گذاری تھی۔ بلکہ اس کے چشم و گوش کھلے ہوئے تھے۔ اور تا دم آخر اس کا ضمیر روشن افکار جدیدہ کو قبول کرنے کو تیار تھا۔ اس وقت سے مدتوں پہلے کہ جب "شعلۂ بیباک" وسعت عالم پر پھیل جائے اور اپنی آتش جہاں سوز سے ہر چیز کو جلا کر خاک و خاکستر کر دے، اقبال نے یہ نصیحت کی تھی:-

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

جو لوگ شاہراہِ زندگی سے کنارے خواب میں غافل ہیں یا عالم رؤیا میں غوطے کھا رہے ہیں ان کو اقبال بیدار کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ ان کیلئے

؎ مقالہ نگار کی مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جن کی یہ رباعی مشہور ہے۔

شاہ است حسینؑ و بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ و دیں پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

اس دنیا کے مشاغل میں شریک ہونا اور امور عالم و مقدّرات بشری کے نظام میں اپنا فرض ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کے دلکش و طرب انگیز اشعار دعوت دیتے ہیں کہ زندگی میں فکر و عمل کو ہم عنان بنانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے :۔

ساحل افتادہ گفت من کہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم۔ گر نہ روم نیستم

اس رباعی کی بیت آخر ایک آئینہ ہے جس میں فلسفۂ اقبال روشن و جلوہ گر ہے۔ اس شاعر کی نظر میں فکر راکد و بے عمل ایک غار تیرہ و تار ہے۔ اس لئے وہ ان تمام ملل شرق کو جو بطالت فکر کے سبب سے اس غار میں پڑی ہیں، عجز و سستی اور رضا بقضا کے عواقب و نتائج سے آگاہ کرتا ہے اور جو لوگ خدا کو اماکنِ خاموش اور صحراؤں یا پہاڑوں میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کو بتاتا ہے کہ خدا خود تمہاری جماعت میں ہے :۔ "خدا خود در تلاشِ آدمی ہست"۔ یا بقول مسیحؑ "ملکوت خداوندی تمہارے درمیان موجود ہے"۔

تمام شعرائے مشہور نے لوگوں کو اخلاقی نصیحتیں کی ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ ہر نصیحت گر ذوق شاعرانہ نہیں رکھتا۔ اور ان ناصحوں میں ایسے بھی ہیں کہ بیشتر اوقات اپنی نصائح ملال آفریں سے ہماری روح کو افسردہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اقبال انتخاب الفاظ میں مہارت کامل رکھتا ہے اور اکثر اسکے

اک کلمہ سے پوری رباعی کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً "پہلوان مبارز" کنایہ ہے اس قوت سے جو اعمال نیک اور مقاصد حسنہ کیلئے صرف ہوتی ہے۔ اسی طرح "پروانہ" اور "کرم شب تاب"، یعنی وہ کیڑا جو چھوٹی سی مشعل کیطرح درختوں کے پتوں میں نور افشانی کیا کرتا ہے کنایہ ہے ایک ایسے شخص سے جو خود اپنی راہ کو روشن کرتا ہے اور دوسروں کے نور کا محتاج نہیں ہوتا۔

اقبال کے اشعار میں انسان اور خدا کے درمیان حیرت انگیز مکالمات نظر آتے ہیں جن میں شاعر نے انسان کے مقام کو بیچارہ و گنہگار مخلوق کے مرتبہ سے ایک ایسی ہستی کی منزلت تک بلند کیا ہے جو بنائے جہاں اور طرح آفرینش میں اپنی ایک قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اقبال یہ جرأت رکھتا ہے کہ اپنے خالق سے کہتا ہے:-

تو شب آفریدی۔ چراغ آفریدم
شغال آفریدی۔ ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اور اس طریقہ سے آیۂ شریفہ:- اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے مفہوم حقیقی کو ہمارے ذہن نشین کرتا ہے۔ تورات کا یہ مقولہ بھی کہ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا"۔ اسی مفہوم کا قرینہ ہے۔ بال جبریل میں ایک مکالمہ

شیطان و جبریل کے درمیان ہے۔ اقبال اس فرشتۂ مقرب کو اطاعت محض کا نشان سمجھتا ہے، اور ابلیس کو دریائے پر آشوب کا استاد تیراک کہتا ہے۔ یہ عقیدہ بعض لوگوں کی نظر میں تلخ و ناگوار ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جو تمام عمر امراض روحانی میں مبتلا رہے ہیں، اس سے بہتر علاج ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کی یہ آواز صور اسرافیل کی آواز کی طرح دنیا کے مردہ دل انسانوں کے پیکر میں روح پھونک دیتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اقبال کی نظر میں "مجاہد" سے مراد سخت گیر جابر اور مطلق العنان انسان نہیں ہے، بلکہ وہ شخص ہے جو دل درد آشنا بھی رکھتا ہو۔ اقبال نے اس نکتہ کو ایک تشبیہ میں خوب بیان کیا ہے:-

تنے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دل درد آشنائے
چو جوئے در کنار کوہسارے

بودھ کی تعلیم ہے کہ آدمی کا دنیا میں آنا خود "علتِ اندوہ" ہے۔ لیکن اقبال کے عقیدے میں ولادت انسان "مایہ شادمانی" ہے۔ اور شاعر نہایت وجد و شور کے عالم میں کہتا ہے:-

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن کرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل
حذر اے پردگیاں! پردہ درے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

تعلیم بودھ کا اصول "انکار حیات" ہے۔ وہ زندگی کو انسان کے رنج واندوہ اور درد و تیرہ بختی کا سب سے بڑا سبب جانتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ روح کی نجات و آزادی موقوف ہے زندگی کی فنائے تام و کامل پر۔ لیکن اسکے برعکس دین اسلام میں زندگی سے کنارہ کشی صریحاً ممنوع ہے۔ اقبال کی نظر میں کوئی وجہ نہیں کہ انسان بدبین و ناامید ہو اور اس کو دنیا تیرہ و تار نظر آئے۔ بلکہ جس طرح اگلے لوگ طلوع فجر یعنی روزِ نو کے پیش خیمہ اور طلایہ دار کی تعریف کرتے تھے، اسی طرح ہمارا شاعر بھی حیات کو جس کی تعبیر ولادت آدم ابوالبشر کے ساتھ کی جاتی ہے، مرحبا کہتا ہے۔ زندگی کوئی ساکن و بے حرکت تالاب نہیں ہے کہ دلدل سے بھرا ہو۔ بلکہ زندگی ہمیشہ جنبش و تغیر میں رہتی ہے۔ انسان کامل بھی یعنی وہ ہستی جسکو اقبال "مرد مومن مجاہد" کہتا ہے، ہمیشہ حرکت و تغیر میں ہے اور دریاے حیات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ انسان کامل ان تحولات و تغیرات کا صرف نظارگی نہیں، بلکہ خود بھی اس سیل کا ایک جزء اساسی ہے اور

اس سے جدا نہیں رہ سکتا۔ ایسا انسان زندگی کی مسرتوں سے لذت یاب ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ زندگی کی سختیوں اور دشواریوں سے جنگ بھی کرتا ہے اور ان کو اپنی راہ میں حائل نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے کہ وہ ایمان و یقین رکھتا ہے اور یہ اس کے دو سلاح جنگ ہیں۔ حقیقت میں کون ہے جو بغیر ایمان کی پشتیبانی کے جنگ کر سکتا ہے۔ حیات ہر چیز کا سرچشمہ ہے اور بقولِ اقبالؔ "بود و نبود ما ست زیک شعلۂ حیات"۔ لیکن موت بھی سر منزلِ آخر نہیں۔ بلکہ ایک نئی زندگی اور تازہ کشمکش کا آغاز ہے۔ یہ فلسفہ باوجودِ نقائص ایک زندگی بخش فلسفہ ہے۔ اقبالؔ زندگی کا وصّاف و مدّاح ہے۔ اس لئے کہ زندگی دلکش، پر اسرار اور جادوانی ہے۔

بہت سی ملتیں ہیں جو ہمیشہ اپنی گذشتہ تاریخ پر نظر رکھتی ہیں، لیکن باوجود اس کے، ایامِ عشرتِ فانی جن کی صرف یاد ہی باقی ہے، ان کو دوبارہ واپس نہیں لا سکتیں۔ اقبالؔ ماضی کو مرکزِ توجہ بنانا بے سود سمجھتا ہے، اسلئے کہ اس کے عقیدے میں زندگی ایک دریا ہے زود گذر و بوقلموں کہ ہر دم رنگِ دگر اختیار کرتا ہے، ماضی ساکن و راکد ہے۔ حالِ فعّال و بیقرار و متغیّر اور مستقبل نہایت بے صبری کے ساتھ مادرِ وقت کے شکم سے متولّد ہونے کا منتظر ہے۔

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است　　بخاک تو شرار زندگی نیست[۱]

---

[۱] عربی کا مقولہ ہے: مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْن (جس کے دو دن ایک سے گذرے وہ نقصان میں رہا) (مترجم)

لیکن دیکھو کہ حیات کس قدر باعظمت و پر جلال ہے! زندگی کے انھی چند گریز پا لمحوں میں شعلۂ حیات ہماری تمام ہستی کو گھیر لیتا ہے۔ اور ہم ایک دم میں مشاہدۂ حقیقت یا ادراک معرفت سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لمحے ہر شخص اور ہر روز کی زندگی کو نصیب نہیں ہوتے۔ شاید تنہا اولیاء و اصفیا اس نعمت سے فیضیاب ہوتے ہیں:۔

ہر کس نشناسندہ راز است و گرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است (عرفی)

ممکن ہے شاعر معروف کیٹز (KEATS) کا بھی یہی مقصود ہو اس قول سے:۔
"کاش زندگی تمام شور و وجد و نشاط ہوتی نہ فکر"۔ اقبال کہتا ہے:۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت
ومے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، اقبال کے عقیدے میں انسان کامل وہ ہے جو مرد میدان رزم بھی ہو اور روح شاعرانہ کا حامل بھی اور جمال پرست بھی۔ اس لئے کہ ایسا شخص زندگی کے مظاہر گوناگوں سے بھی لذت یاب ہوتا ہے اور موت سے بھی بے خوف رہتا ہے۔ مثلاً بابر بادشاہ کو ان انسانوں میں شمار کر سکتے ہیں جنہوں نے رزم و پیکار اور روح جمال پرست دونوں کو اپنی ذات میں جمع کیا ہے۔
لیکن حصول کمال کا عشق اور عقائد بلند سے دلبستگی بے سود ہے اگر ہم

اس بات پر آمادہ نہوں کہ ان چیزوں کی خاطر جنگ کریں اور ان کی حفاظت اپنے ذمہ لیں جس وقت عمر کے گھنٹے کی سوئی رفتار قہقرائی شروع کرے گی تو بار زندگی ہمارے دوش پہ گراں ہوگا، ہمارے دن بے نور اور راتیں تاریک ہونگی۔ پس ہر گز مستقبل سے ناامید نہونا چاہیئے اس لئے کہ جنگ زندگی کے میدان میں ایمان و یقین ہی کام آتا ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

موجودہ زمانے میں جب انسانوں کے روح و قلب پر بار حوادث نہایت سنگین ہے اور جہانِ کہن کے در و دیوار ہر طرف سے ٹوٹ رہے ہیں، اور ابھی جہان نو بھی مادر روزگار کے بطن سے نہیں نکلا ہے، اقبال کے اشعار نہ صرف درس عبرت دیتے ہیں، بلکہ سرمایۂ لذت و نشاط بھی ہیں۔ اس کی نظمیں عجیب سرور پیدا کرتی ہیں، جب ہم ان کے شہد سے لذت گیر ہوں گے تو اقبال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔

بیا کہ دامنِ اقبال را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشان خانقاہی نیست

اقبال کا تصوف

از

جناب ساجد حسن صاحب قادری
ایم اے۔ بی ٹی (علیگ)

کہا جاتا ہے کہ اقبال فلسفی ہے، مفکر ہے، محقق ہے، مصلح ہے بیشک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ صوفی بھی ہے۔ اور یہ پہلو ان کی تمام شاعری اور خصوصاً آخر دور میں نہایت روشن ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ باوجود یکہ اس عرصہ میں اقبال پہ ہر موضوع اور عنوان پر طویل اور محققانہ مضامین لکھے گئے اور ضمناً اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی، لیکن اس عنوان پہ مستقل اور مفصل مضامین بہت کم لکھے گئے۔ بلکہ بعض ناقدین اقبال کا تو یہ خیال ہے کہ اقبال سرے سے صوفی تھے ہی نہیں۔ اور نہایت اصرار سے یہ کہتے ہیں کہ وہ تصوف کے قطعی خلاف تھے۔ اور اس سلسلہ کو بنی نوع انسان کے لیے نہایت مہلک اور مسلمانوں کے ادبار اور زوال کا باعث سمجھتے تھے۔ یہ خیال محض غلط فہمی اور کلام اقبال کے صرف سطحی مطالعہ پہ مبنی ہے۔ دراصل ان لوگوں نے اقبال کے نظریۂ تصوف کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اقبال اگر فلسفی تھے تو صوفی، مفکر تھے تو صوفی، محقق تھے تو صوفی، اور مصلح تھے تو صوفی تھے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "وہ اپنے آپ کو کبھی بھی فلسفی کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوران گفتگو میں بعض مرتبہ میرے منہ سے بلا ارادہ اگر ان کے لیے فلسفی اور

ان کے خیالات کے لئے نظام فلسفہ کے الفاظ نکل گئے تو انھوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ان کا کوئی نظام فلسفہ نہیں ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ فقیری ان کو وراثتاً ملی ہے اور فلسفہ وغیرہ انھوں نے صرف انھیں حقائق کو جنکا انھیں کلی یقین ہے، عقلی طور پر سمجھنے کے لئے سیکھ لیا ہے"۔

اور خود حضرت اقبال اپنے متعلق فرماتے ہیں:۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز درونِ میخانہ

بیا کہ من زخمِ پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

واقعہ یہ ہے کہ جس ہیئت میں تصوف آج اسلام میں رائج ہے۔ اور جس کا مظاہرہ اور مشاہدہ عام طور سے خانقاہوں اور سجادہ نشینوں میں ہوتا ہے۔ وہ اصل اور صحیح تصوف نہیں ہے۔ جس کی بنیاد آج سے تیرہ سو برس قبل عرب میں پڑی تھی۔ اور صدیوں تک جس کی تلقین و تدریس بزرگان دین اور اولیاء کرام کرتے رہے۔ جب اسلام اطراف و اکناف میں پھیلا اور مختلف مذاہب کے

لوگ مشرف بہ اسلام ہونا شروع ہوئے تو وہ اپنے ساتھ اپنے قدیم فلسفے کے اثرات بھی لائے۔ جس کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں فلسفہ و حکمتِ یونان و ایران و ہندوستان کے اثرات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ تخیلات خالص اسلامی تعلیمات میں اس طرح گھل مل گئے کہ اب ان کا الگ کرنا محال ہو گیا۔ انھیں خیالات کو اسلامی شعراء نے اشعار کے ذریعہ ہر خاص و عام تک پہونچا دیا۔ جیسا کہ حضرت اقبال اسرار خودی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"مختصر یہ کہ ہند و حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا۔ یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا۔ اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہونچکر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ صوفیائے کرام" افلاطونیان جدید کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے ماخذ کی طرح خود بھی "تشاؤم و قنوط" کے قائل ہو گئے۔ اور کسر نفسی، ترک خودی، اور خود شکنی وغیرہ کی تعلیم پر زور دینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خیال عوام میں بھی پھیلنا شروع ہوا اور آخر کار وہ قوم جس کی بنیاد احساس نفس و خودی اور عمل پر رکھی گئی تھی ان تعلیمات سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ انھوں نے اسے اپنا لائحہ حیات بنایا۔ اور اس کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ کر اپنے آپ کو بیکس و بیکار اور مجبور و معذور سمجھنے لگے۔ اسی وجہ سے وہ بام عروج سے قعر مذلت میں جا گرے۔ یہ ہے وہ نظریہ تصوف جس کے خلاف اقبال جہاد کرتے ہیں۔ وہ اصل میں تصوف

سے اختلاف نہیں کرتے بلکہ وہ تصوف کو غیر اسلامی اجزاء سے پاک کر کے اس کی اصلی اور پاک صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خود علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے اور یہی مفہوم قرن اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"

نیز علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ احساس خودی، عرفان نفس اور خودشناسی ہی انسان کی تولید و تخلیق کا اصل منشا ہے اور خودی ہی اصل زندگی ہے۔ ع خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے۔ اور خودی کا استحکام منحصر ہے صرف عمل پر۔ ع عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

جس طرح ہر انسان میں یہ خودی ہوتی ہے اسی طرح یہ ہر قوم میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی کو "روح قومی" بھی کہا جاتا ہے۔ اور قومی خودی کی طرح تمام انسانیت کی بھی ایک خودی ہوتی ہے جس کا احساس سب سے پہلے آنحضرت صلعم نے پیدا کیا۔ اور قومی و ملکی اور نسلی جملہ اختلافات مٹا کر تمام بنی نوع انسان کو بھائی بھائی بنا دیا۔

انسانی خودی کی طرح تمام کائنات عالم کی بھی ایک خودی ہوتی ہے اور وہی اصل کون و مکان ہوتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں خدا کہا جاتا ہے

پس ظاہر ہے کہ خودی اور خدا میں کسقدر قریبی تعلق ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:
"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یہی تعلیم ہم کو قرآن شریف سے ملتی ہے اور یہی سبق حیات بنی صلعم ہم کو دیتی ہے اور یہی مبدأ و منشار تصوف ہے۔ اور یہی اقبال کی تعلیم اور شاعری کی روح ہے۔

علامہ اقبال اپنے لکچر میں جسکا موضوع "انسانی خودی۔ اسکی بقا و حریت" ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"قرآن پاک اپنے سادہ اور پر زور انداز میں انسان کی انفرادیت اور یکتائی پر زور دیتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن وحدت حیات کے لحاظ سے انسان کے منتہائے کمال کی بابت خاص نظریہ رکھتا ہے"

اسی لکچر میں وہ دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:۔

"صرف تصوف نے ہی اس کی کوشش کی ہے کہ باطنی تجربات و احساسات کو سمجھا جا سکے"

پس ظاہر ہے کہ اقبال کو غیر صوفی یا مخالف تصوف کہنا کس درجہ نادانی اور کم فہمی ہے۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور قومی شاعری کا دور کہلاتا ہے۔ لیکن یہ دور زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا جس کے اسباب قیام یورپ اور تحریک تصوف اسلام کا مطالعہ ہیں۔ جس کی وجہ سے اقبال مغربی تہذیب و تمدن کے مخالف اور مادیت سے متنفر ہو گئے۔ اور روح کو دنیا کی اصل حقیقت سمجھنے لگے۔ دوسرا دور اقبال کی فطری شاعری کا دور ہے۔ اور بقول ڈاکٹر

قاضی عبدالحمید صاحب کے "اس دور میں بھی تصوف کا ہلکا سا رنگ اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ فطرت انسانی اور خارجی فطرت میں ایک عجیب ہم آہنگی اور ارتباط محسوس کرتا ہے"۔ اس کے بعد کا زمانہ اقبال کی اسلامی شاعری کے دور کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں عالم اسلام میں آزادی کی روح پیدا ہو چکی تھی اور جنگ طرابلس و جنگ بلقان۔ جنگ عظیم اور جنگ اناطولیہ نے مسلمانوں کے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ چنانچہ اقبال بھی اس سے بہت متاثر ہیں۔ بیسویں صدی میں مسلمانان ہند و ایشیا میں آزادی کی تحریک میں بھی اقبال کا زبردست ہاتھ ہے۔ اس دور کی شاعری کی بنیاد قرآن کے روحانی اور اخلاقی قوانین پر ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب اپنے مضمون "اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے تصور کائنات پر بالآخر خالص اسلامی رنگ چڑھ گیا، غزالی و رومی کا مطالعہ کرتے کرتے بالآخر شراب حقیقت کا پیاسا اصل سرچشمہ زندگی تک پہونچ گیا۔ قرآن ہدایت انسانی کے لئے آخری صحیفہ ہے۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر کائنات کے تمام اسرار سربستہ کھل جائیں۔ رسول اللہ صلعم کی زندگی قرآن کی ایک عملی تفسیر ہے"۔ "انسانی نشوونما کے لئے بنیادی قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے۔ وہ قرآن میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان اصولوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ مختلف حالات کے لئے جزئیات میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ سو وہ ان اصولوں سے استنباط کئے جا سکتے ہیں۔ یا ضرورت زمانہ کے

مطابق ان کی تاویل کی جاسکتی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اس کو اجتہاد کہتے ہیں۔ لیکن یہ اجتہاد ہمیشہ قوانین وسنت کے تابع ہوگا" اقبال قدیم اکابر اسلام کے نظریات سے اختلاف نہیں کرتے بلکہ دور حاضر کے مسلمان سے علوم وفنون کی روشنی میں تمام مسلمات ونظریات اسلام پہ دوبارہ غور کرنے کی، بغیر علمائے سلف سے اختلاف پیدا کئے ہوئے التجا کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہایت وضاحت سے کہدیتے ہیں کہ رشد وہدایت کا اصل سرچشمہ وجدان وعشق ہے اور نئے علوم وفنون کی مدد سے روحانی حقیقت سمجھانے کی ضرورت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اصل سرچشمہ سے سیراب نہیں ہونا چاہتے۔ اس لئے کہ تمام انسان یکساں نہیں ہوتے۔ اور بعض مذہب اور پیغمبر کی بھی پیروی بغیر دلیل نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ سائنس کی رہنمائی معتبر نہیں کہی جاسکتی۔ اور زیادہ سے زیادہ وہ مذہب کے بنیادی اصولوں تک پہونچا سکتی ہے۔ جزئیات کا حل اس کے امکان سے باہر ہے۔ نیز یہ کہ یہ رہنمائی ہمیشہ قابل یقین بھی نہیں ہوا کرتی۔

اقبال نے تصوف کے اصلی معنی لئے ہیں اور اس کو اصلی اسلامی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور چونکہ ایسا کرنے میں انھوں نے بعض تصوف کے مروجہ اصولوں کی مخالفت کی ہے اسلئے لوگ ان کو دائرۂ تصوف میں سے خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے ہم کو اقبال کا ممنون احسان ہونا چاہیئے کہ انھوں نے تصوف کے غیر اسلامی اور خارجی

عنصر کی طرف توجہ دلا کر اسے پاک کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب ہم بعض صوفیانہ مسائل کے متعلق اقبال کے خیالات پیش کرتے ہیں:۔

تصوف دراصل اسلام کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اور اسلام سے اسکا وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے۔ تصوف صرف ایک دوسرا نام ہے طریقت کا اور طریقت شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ مولانا رومؒ دفتر پنجم کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "شریعت ہمچو شمعی است کہ راہ می نماید چوں در راہ آمدی ایں رفتن تو طریقت است دچوں بہ مقصود رسیدی آں حقیقت است"۔ گویا شریعت علم ہے اور تصوف عمل۔ پس جو تصوف ہم کو اسلام کے اساسی اصولوں سے دور لے جاتا ہے یا کوئی کام شریعت کے احکام کے خلاف کرتا ہے تو اس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں رہتا چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن باعماق حیات
فاش می خواہی اگر اسرار دیں
جز باعماق ضمیر خود مبیں

مسلمانوں پہ اتباع شریعت فرض ہے۔ اسی میں ان کی ترقی اور اصلاح، فلاح اور بہبود کا راز مضمر ہے۔

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں
پختہ تر از دے مقامات یقیں
ملّت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے
ہم عصا و ہم ید بیضا ستے
با تو گویم سرّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع

اور اتباع شریعت نام ہے اتباع رسولؐ اور اتباع قرآن کا۔

غنچۂ از شاخسار مصطفیٰ
گل شو از باد بہار مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو بالا گرفت
بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم
رحمت او عام و اخلاقش عظیم

انسان کی تخلیق کا مقصد جیسا کہ کہا جا چکا ہے احساس خودی ہے۔ اور اس کی منزل مقصود خود نگہداری اور استحکام خودی ہے اور خودی کو مستحکم کرنے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول سے جنگ و جدل رکھے اور اپنے مقاصد اور آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے رکاوٹوں کو اور مشکلات کو دور کرے۔ اس جد و جہد کے ذریعہ سے انسان برابر اپنے مقاصد میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ سکون خواہ وہ جنت ہی کا کیوں نہ ہو خودی کی موت کا مرادف ہے۔ خودی کی ترقی اس کاخ دکو ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ طبعی موت کے بعد اس کا میدان اور وسیع ہو جاتا ہے۔

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

لیکن جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اپنے مضمون "اقبال کا تصور خودی" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور رہنما عشق ہے عشق اس مرد کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفت نفس کے مدارج سے گذر کر خودی کی معراج پر پہونچ چکا ہے۔ محبت کا دوسرا نام تقلید ہے۔ لیکن

یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویت حاصل کرے۔ بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے۔ اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگیست
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق
ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلید یار
تا کمند تو شود یزداں شکار"

پس ظاہر ہے کہ اقبال سلسلہ بیعت اور ضرورت شیخ کے قائل تھے اور انسان کے مقصد کے پورا ہونے کے لئے ایک روحانی رہنما کی ضرورت لابد سمجھتے تھے۔ لیکن آپ عصر حاضر کے عام مشائخ سے کافی بدگمان ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

تھا جہاں مدرسۂ شیری دشاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی
نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی
لذت نغمہ کہاں مرغ خوش الحاں کیلئے
آہ اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی

مگر ساتھ ہی ساتھ اقبال اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ "نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"۔ چنانچہ باوجود اولیاء اللہ کی کم یابی کے آپ تلقین کرتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی دنیا بزرگان دین سے خالی نہیں ہے لہذا صحیح ارادت کے ساتھ ان کو ڈھونڈنا چاہیے۔

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز
دین و دولت قمار بازی
ناپید ہے بندہ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شان بے نیازی

تصوف میں توحید یا وحدت الوجود کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے یہی وہ مسئلہ ہے جس نے عوام تک پہونچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوق عمل سے محروم کر دیا، اور وحدت الوجود کے عقیدے ہی کی بدولت جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے اسلام کے پیرو بھی اسی غفلت و جمود کا شکار ہو گئے جو ایشیا کی اور قوموں پہ طاری تھا۔ لیکن فی نفسہ یہ مسئلہ وحدت الوجود اس قدر زہر آلود نہیں ہے جیسا کہ اسے خیال اور بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ در اصل اس مسئلہ کا غلط اشتہار اور تلقین ہے جس نے کہ مسلمانوں کو یہ نقصان پہونچایا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں " حضرات صوفیہ کے نزدیک توحید کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی چیز عالم میں موجود ہی نہیں یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اسی کو ہمہ اوست کہتے ہیں، یہ مسئلہ اگرچہ تصوف کا اصول موضوعہ ہے لیکن اس کی تعبیر اس قدر نازک ہے کہ ذرا سا بھی انحراف ہو تو یہ مسئلہ بالکل الحاد سے مل جاتا ہے" چنانچہ یہی ہوا کہ عام طور سے لوگوں نے اس مسئلہ کے دقیق نکتے کو نہیں سمجھا اور جو مفہوم مروج ہوا وہ یہ کہ وجود حقیقی صرف خالق کائنات کی ذات ہے۔ مخلوق جس میں عالم طبیعی اور انسان سبھی شامل ہیں محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں۔ اور انسان کی ہستی یا خودی اسکو مشاہدہ حق اور وصل خدا سے باز رکھتی ہے۔ لہذا سب سے پہلے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی خودی کو زائل کرے اور تمام دنیاوی قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو کر فنا فی اللہ ہو جائے۔ اس عقیدہ نفی خودی کے اقبال سخت مخالف تھے۔ اور "اثبات خودی" کے ذریعہ سے اس نظریہ کو باطل کرنا چاہتے تھے۔ مسئلہ توحید اور فنا فی اللہ کے وہ بھی پورے طور سے

قائل ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف "تخلّقوا باخلاق اللّٰہ" کے مطابق انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کے اوصاف اپنی ذات میں پیدا کرے۔ چنانچہ جس قدر یہ اوصاف انسان اپنے اندر زیادہ پیدا کرتا جائے گا اتنا ہی وہ خدا سے نزدیک تر ہوتا جائے گا۔ اور جو خدا سے زیادہ نزدیک ہوگا وہی زیادہ کامل انسان ہوگا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنی ہستی باری تعالیٰ کی ذات میں مدغم کر دیتا ہے برخلاف اس کے وہ خدا کی ذات کو اپنی ہستی یا خودی میں جذب کر لیتا ہے۔ کامل انسان اول مادہ کو جذب کرتا ہے اور پھر خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ نتیجہ اس کا بھی وہی ہے یعنی توحید یا فنا فی اللّٰہ۔ عوام کے عقیدے کے مطابق انسان کی خودی زائل ہو جاتی ہے لیکن اقبال کے نظریہ کے مطابق انسان کی خودی برقرار رہتی ہے۔ اور مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال اپنے لکچر میں اسکو بجنسہ اسی طرح واضح فرماتے ہیں:۔

"اعلیٰ اسلامی تصوف میں مقامات توحید طے کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کی خودی اپنے آپ کو فنا کر کے اس قادر مطلق کی خودی میں کسی طرح بھی جذب یا مدغم کر دے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قادر مطلق کی لازوال خودی اسکے آغوش میں آجائے۔"

مسئلہ انا الحق کے متعلق جو توحید ہی کا ایک بلند درجہ ہے اقبال کہتے ہیں:۔

اگر فردے بگوید سرِ زنش بہ
اگر قومے بگوید نار دانیست

بجام نو کہن مے از سبو ریز
فروغ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخ منصور
بہ دل لا غالب الّا اللہ فرو ریز

عام طور سے صوفی یہ کہتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ خالق مطلق اس میں اپنے حسن و جمال کا نظارہ کرے۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں:۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اقبال بھی اس پر یقین رکھتے ہیں:۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید
از نقش این و آن بہ تماشائے خود رسید

لیکن اور صوفیوں میں اور اقبال میں یہ فرق ہے کہ ان کے نزدیک ماسوا اللہ کا کوئی وجود نہیں۔ اور وہ محض تخیل کی فریب کاری ہے لیکن اقبال کے لئے ہر چیز کا ذاتی وجود ہے۔

غالب کہتے ہیں:۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

برخلاف اس کے اقبال کے خیال میں تمام موجودات میں خودی کی روح پوشیدہ ہے۔ چنانچہ انسان بھی اس خودی کو ترقی دیکر اور برقرار رکھ کر خدا کا

وصل حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ایسے وصل کے قائل نہیں جس میں قطرہ کا وجود دریا میں زائل ہو جائے۔ ان کے نزدیک دیدار و معرفت الٰہی سے خودی کی آب و تاب کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم — گر ادہست حقا کہ من نیستم
ولیکن ز دریا بہ آمد خروش — ز شرم تنک مایگی رو مپوش
ز موج سبک سیر من زادۂ — ز من زادۂ در من افتادۂ
بیاسائے در خلوت سینہ ام — چو جوہر درخشش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوش شبنم بزی — فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

انسان کے لئے بہترین راستہ شریعت اور طریقت کی رو سے تسلیم و رضا کا ہے۔ یعنی وہ ہر حادثۂ دنیاوی کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کرے اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرے اور سمجھے کہ 'ہر چہ از دوست می رسد نیکوست'۔ تسلیم و رضا سے انسان میں سکوت و جمود کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے قوائے عملی میں اور زیادہ تحریک ہوتی ہے۔

ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہی پیدا — پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمتکدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا — ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں گشت و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہ عمل بند — مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اگر صحیح طریقہ سے تسلیم و رضا اختیار کی جائے تو وہ زندگی کو محکم

کرتی ہے اور اگر غلط طریقہ سے اختیار کی جائے تو وہی جمود و سکوت پیدا کر دیتی ہے۔

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست
موت نیرنج و طلسم و کیمیاست

کار ما غیر از امید و بیم نیست
ہر کسے را ہمت تسلیم نیست

کار مردان است تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

اسی طرح مسئلہ تقدیر ہے۔ کہ لوگوں نے اس کا اصل مفہوم نہیں سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ہر عمل کو تقدیر کا پابند سمجھنے لگے۔ اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی تقدیر پہ بھروسہ کر کے بیٹھ گئے۔ حالانکہ یہ بات اصل تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔ خدا نے خود اس دنیا کو عالم اسباب و علل کہا ہے اور انسان کو اپنے عمل کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام خود عمل کی زبردست تلقین کرتا ہے اور خود آنحضرت صلعم کی زندگی اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ تقدیر کا اسلامی نظریہ ہرگز بے عملی اور کسالت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور مرد مومن خود اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

چنانچہ حضرت اقبال مسئلہ تقدیر یوں واضح کرتے ہیں:۔

اے کہ گوئی بودنی ایں بود شد
کارہا پابند آئیں بود شد

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ
نے خودی را نے خدا را دیدۂ

مردِ مومن با خدا دارد نیاز
با تو ما سازیم تو با ما بساز

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاکِ او با سوزِ جاں ہمراہ نیست

مسئلہ جبر و اختیار کے غلط افہام نے بھی مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اکثر صوفیہ کرام انسان کو مجبورِ محض مانتے ہیں اور بعض انسان کو مختارِ مطلق کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں نظریوں اور خصوصاً پہلے نظریہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مولانا رومؒ نے اس کی بہت مذمت کی ہے اور طرح طرح سے یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان ایک حد تک اپنے عمل کا مختار ہے لیکن نہ وہ مختارِ مطلق ہے اور نہ مجبورِ محض۔ اقبال کا بھی یہی عقیدہ ہے فرماتے ہیں:-

بہ رومی گفت با من راہبِ پیر
کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را
ترا تقدیر و ما را گشت تدبیر

پس ظاہر ہے کہ "اقبال دراصل ایک صوفی شاعر تھا۔ وہ منفی تصوف کا نہیں بلکہ اثباتی تصوف کا قائل تھا۔ منفی تصوف وہ ہندی عجمی تصوف ہے

جو انسان کو اس دنیا سے بے تعلق کر کے صرف روحانیت میں گم کر دے۔ اثباتی تصوف اسلامی تصوف ہے جو انسان کا روحانیت سے اس طرح تعلق باقی رکھے کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ انفرادی اور اجتماعی فرائض انجام دے۔ اس کی سب سے اعلیٰ مثال رسول اللہ صلعم کی زندگی میں ملتی ہے۔ اقبال کو رسول اللہ کی ذات سے عشق تھا وہ خاک پاک حجاز میں مرنا جینے سے بہتر سمجھتا تھا۔"

اقبال ہندوستانی مسلمانوں کی خستہ حالی اور ابتری پر کڑھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں پر جمود و سکوت کی عجیب کیفیت طاری ہے وہ صرف نام و نمود کے مسلمان ہیں نہ انمیں "زور حیدری" ہے اور نہ "استغنائے سلمانی" وہ مسلمانوں میں بیداری کی نئی روح پھونکتے ہیں ان پر انکی اصل حقیقت اور مرتبہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں خودی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور نوجوان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اسی لئے اقبال گوشہ نشین صوفیہ اور خشک زاہدوں کو پسند نہیں

کرتے۔ بلکہ انھیں مسلمانوں کے زوال و ادبار اور کسالت و بے عملی کا سبب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خودداری و گلبانگ انا الحق
آزاد ہو سالک تو یہ ہیں اسکے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اسکا ہمہ اوست
خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

اقبال کا مومن

از

جناب زاہد حسن صاحب فریدی ایم اے

خداوند تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسے اپنا نائب و رازداں بنایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ کے شرف سے ممتاز فرمایا بزرگی و برتری کے انتہائی مدارج پہ سرفراز کیا۔ اپنے تمام اوصاف جمیلہ اور خصائص جلیلہ ودیعت فرمائے۔ ان اوصاف کے ساتھ ساتھ نفسانی و شیطانی خواہشات بھی رکھیں تاکہ ان متضاد خصوصیتوں کے باوجود یہ انسان احکام الٰہی کا پابند رہ کر ہوا و ہوس کو اپنے قبضہ و اختیار میں رکھ کر اپنے آپ کو جامۂ انسانیت اور لباس شرافت و بزرگی سے ملبوس رکھے۔ ان متضاد اوصاف کی بنا پر ہی انسان اشرف المخلوقات ہے۔

جب انسان احکام خداوندی کو فراموش کر دیتا ہے۔ تعلیمات پیغمبر و رُسل سے انحراف کرتا ہے۔ اپنی عقل و دانش کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ہر چیز کو اپنی کوتاہ عقل و کوتاہ نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے تو اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا مصداق بن جاتا ہے اور اس مسند جلیل اور اس نیابت خداوندی سے گر کر قعر ضلالت و گمراہی میں جا پڑتا ہے۔

خداوند تعالیٰ خود قران شریف میں فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (ہمنے انسان کو بہترین صورت و قوام میں پیدا کیا۔ لیکن پھر ہمنے اس کو نیچے سے نیچے طبقہ میں گرا دیا۔)

اس زمانہ کا مسلمان ایک عجیب ہیجانی کیفیت اور بحرانی حالت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ہر فرد خود غرضی اور نفس پرستی کا شکار نظر آتا ہے۔ نخوت و تکبر رعونت و گھمنڈ کا فرعون و نمرود بنا ہوا ہے۔ اپنے دوزخ کو بھرنے کے لئے غریبوں اور یتیموں کے مال و جائداد کو نہایت بے دردی سے غصب کرتا ہے تمام عالم میں آہ و بکا نالہ و فریاد کا شور برپا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے مظالم سے مصیبت و فلاکت میں گرفتار ہے۔ انھیں لوگوں کے واسطے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰىہُ (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات و اغراض کو اپنا خدا و معبود بنا رکھا ہے) مسلمان نے خلق و محبت کو کھو دیا۔ اخوت و مساوات سے بیگانہ ہوگیا۔ بے نفسی و ایثار شفقت و رافت سے کوسوں دور جا پڑا۔ پاکیٔ فطرت، تہذیب نفس کو فنا کر دیا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ سب فیضان و برکت ہے تہذیب مغرب، نئی روشنی اور تعلیم فرنگی کا۔ مغربی تہذیب، مغربی اصول زندگی، مغربی تمدن ہی اب سب کچھ ہے۔ یہی اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گیا ہے۔ مغربی علم و ادب، فرنگی آئین و تہذیب اس درجہ دل و دماغ پر چھا گئے ہیں اور انھوں نے دین و مذہب اور احکام الٰہی

سے اس قدر بیگانہ ولاعلم کر دیا ہے کہ اب تعلیم نبویؐ سے کوئی دلبستگی وعقیدت، احکام الٰہی کی کوئی عزت و وقعت دلوں میں باقی نہیں رہی۔ صرف باقی ہی نہیں رہی بلکہ مذہب اسلام کا استہزا مضحکہ اڑانا فیشن میں داخل ہوگیا۔ اس کے احکام میں بھی ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہوچکا ہے۔ اسلئے کہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد خیال، آزاد رائے اور مطلق العنان تصور کرنے لگے ہیں۔ کسی کو اپنے سے زیادہ عقلمند، اپنے سے زیادہ صاحب ہوش وخرد تصور نہیں کرتے۔ علم وحکمت، تہذیب وفلسفہ، سیاست ومدنیت میں انکے قوانین صحیح، ان کے اصول درست، ان کا فیصلہ اٹل، ان کی رائے صائب اور ان کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مذہب وملت، دین واسلام، شریعت وطریقت کو اپنی عقل کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اپنی خواہش کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی عینک لگاکر قرآنی معانی ومطالب میں تاویل وتحریف کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:۔

ہے کسکی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے — حریت افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتشکدہ پاس — چاہے تو کرے اسمیں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا — اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

اس آزاد خیالی اور آزادانہ تفکر وتدبر پر جو مسلمان نازاں ہیں اس کی حقیقت علامہ کی زبان سے سنئے:۔

آزادیٔ افکار ہے انکی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر وتدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

علامہ اقبال خود مغربی فلسفہ و تعلیم کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہاں رہ کر مغربی مدنیت و تہذیب کا کما حقہٗ مطالعہ کیا۔ ہر ہر چیز کو ہر پہلو سے دیکھا اور پرکھا ہر شے کی قدر و ہیئت کو بہ امعان نظر جانچا۔ ژرف نگاہی اور حقیقت پژوہی کے ساتھ فلسفیانہ تنقید، حکیمانہ نظر اور عالمانہ تحقیق کے بعد وہاں کی ظاہری نمود و نمائش، عارضی ملمع کاری، زیب و زینت اور شان و شوکت کی قلعی کھول کر رکھدی تاکہ سادہ لوح اور کوتاہ بین مسلمان فروغ مغربیاں کی صاعقہ بار ضیا پاشی سے خیرہ و مرعوب ہو کر نہ رہ جائیں۔ فرنگی مدنیت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق انکو آنکھ جنکی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

مغربی سیاست کے متعلق سنئے:۔

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ نگر ہیں اسکی پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مغربی تہذیب کی غایت و حقیقت سنئے اور تجربہ کی آنکھ سے اس کے ایک ایک حرف کی مطابقت عملی دنیا میں دیکھئے:۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہی نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

آجکل کے برخود غلط مسلمان کج رو اور کج خیال مسلم کی حالت و کیفیت بھی ملاحظہ فرمالیجئے:۔

عشق ناپید خرد می گزدش صورت مار　　عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اس تہذیب و تمدن، عالمگیر کفر و الحاد، بے دینی و لا مذہبی کے خلاف اقبال نے علم بغاوت بلند کیا۔ ہر پہلو اور ہر نکتہ کی وضاحت نہایت بلند آہنگی و بے باکی سے کی۔ بال جبریل میں مرید ہندی و پیر رومی کا مکالمہ لکھا ہے۔ لعبتان فرنگ، نازنینان یورپ، حوران مغرب کی شوخی و بے باکی، ناز و ادا، مصنوعی ملمع کاری پر تمام مشرق عاشق و فریفتہ ہو رہا ہے۔ دل و جان سے قربان ہے۔ ان کی حقیقت و غایت کو اقبال بیان کرتے ہیں:۔

مرید ہندی پوچھتا ہے:۔

ہے نگاہ خاوراں مسحور غرب　　حور مشرق سے ہے خوشتر حور غرب

پیر رومی جواب دیتے ہیں:۔

ظاہر نقرہ گر اسپید ست و نو　　دست و جامہ ہم سیہ گردد ازاو

صرف یہی ایک شعر تمام طلسم فرنگیانہ اور سحر مغربیانہ کے عارضی و حسین قصر کو پاش پاش کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن افسوس کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس بے دینی و مغرب زدگی کا نتیجہ مذہب سے بے پروائی، خدا سے بغاوت اور احکام دین میں آزادانہ رائے زنی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ خدا کا خوف

رسولؐ کی محبت، دین و مذہب کی حرمت دلوں سے اُٹھ گئی۔ اپنے آپ کو آزاد و خود مختار سمجھتے ہوئے بھی کورانہ تقلید کی محکومی و غلامی میں مقید ہیں۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھکو کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولت سلمانیؓ و سلیمانیؑ

مسلمان کہلاتے ہوئے بھی نامسلمانی، ایثار و بے نفسی کے فقدان اور عالمگیر ہیجان و پریشانی کی وجہ اور واحد سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی خواہشات کو آزاد، اپنے نفس کو بے لگام اور اپنی حرص و آز کو بے قابو چھوڑ دیا ہے۔ دل و دماغ اور قلب و نظر گناہ و معصیت کی آلودگی و تاریکی سے بے نور و بے سوز ہو کر رہ گئے۔ مسلمان کافر سے بدتر ہو گیا۔ امیری و شہنشاہی چھن گئی۔ روح جو لاہوتی الاصل تھی مردہ و بے جان، خودی جو قدسی النفس تھی مجروح و ناتواں ہو کر جسمانیت، مادیت اور شیطانیت کی تیز آگ میں بھسم ہو کر رہ گئی۔

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
میں نے تو کیا دفتر اسرار کو بھی چاک دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

(۲)

مسلمان اس لئے پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی عقل و فراست پر بھروسہ کر کے اپنے خود ساختہ مسائل و نظریات پر عمل کرے۔ اور ہر چیز کو حتیٰ کہ مذہب و شریعت کو اس محدود و ناقص پیمانہ عقل سے ناپے اور اس طرح اپنی خودی اور اسلامی روح کو فنا کر دے بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ توحید و رسالت پر اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب سے ایمان لائے۔ احکام و اصول اسلام کے آگے سر تسلیم جھکا دے۔ اسی لئے ایمان بالغیب کو پہلی شرط قرار دیا ہے۔ ہر انسان کی عقل اتنی وسعت نہیں رکھتی کہ مذہب کے ہر حکم و قانون کو سمجھ سکے اس کی علت و غایت، اسرار و غوامض تک پہنچ سکے اور اسی لئے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ فرمایا ہے۔ مذہب و شریعت میں عقلی گھوڑے دوڑانے اور قیاس آرائیاں کرنے کی اجازت نہیں خلوص نیت اور صدق دل سے شریعت حقہ کے احکام کو تسلیم کرے اور انکی شدّت کے ساتھ پابندی کرے۔ اپنے تمام اعمال زندگی، لائحہ عمل اور پروگرام کو مذہب و قرآن کا پابند بنائے۔ تسلیم و رضا کا مجسمہ بنے۔ صرف زبان سے کلمہ توحید پڑھنے سے انسان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اپنی نفسانی خواہشات کو نہ دبائے۔ دل کو ذلیل خیالات و رکیک خواہشات اور نگاہ کو حرص و آز سے پاک و صاف نہ کرے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر انسان کے اندر رحمانی اوصاف اور شیطانی خواہشات رکھی گئی ہیں۔ جب

انسان مذہب سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ خوف خدا اور خشیت الٰہی اس کے دل سے اُٹھ جاتی ہے۔ کسی کا خوف و خطر نہیں رہتا تو وہ شیطان کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اسکی نفسانیت پوری آب و تاب سے ابھرنے لگتی ہے۔ فرعون بے سامان بن جاتا ہے۔ نفس و شیطان اس پہ سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کی روح و خودی فنا ہو جاتی ہے۔ اس میں ہمت و قوت، جرات و بیباکی نہیں رہتی۔ پیٹ کا بندہ بن کر ہر امیر و حاکم کے سامنے سر جھکاتا ہے اور اس سجدہ ریزی پر فخر کرتا ہے اس لئے کہ اس میں سے احساس خودی و شعور خودداری ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان اور بالخصوص مسلمان کی شان نہیں کہ وہ نفس کا محکوم ہو جائے۔ اسے تو اشرف و افضل بنایا ہے۔ نفس و شیطان پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ نفس کو قابو میں لائے اس کا تزکیہ کرے۔ شیطانی خواہشات کو مغلوب کرے۔ نفس سرکش کا مغلوب کرنا بیحد مشکل کام ہے۔ یہ سالہا سال کی عبادت و ریاضت کو اپنے ایک دھوکہ سے خاک میں ملا کر رکھ دیتا ہے۔ رذیل سے رذیل اور رکیک سے رکیک خیالات کو نہایت حسن و خوبی سے پیش کرتا ہے۔ سادہ لوح، کم نظر اور کور باطن مسلمان شیطان کے جال میں گرفتار ہو کر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور جس ہستی کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا خود اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مسلمان مرد کامل اور بندۂ مومن اس وقت بنتا ہے جب اپنے دل کو حرص،

معصیت اور لذت گناہ سے پاک کرے۔ گناہ کا خیال تک بھی اس کے دل میں نہ آنے پائے۔ نگاہ اس کے قبضہ و اختیار میں ہو۔ اس کی نگاہ میں معصومیت اور بے لوثی پیدا ہو جائے۔ حق گوئی و بیباکی اس کا شیوہ ہو۔ دنیا کی بڑے سے بڑے حاکم و شہنشاہ سے بھی وہ مرعوب نہ ہو سکے۔ اگر یہ حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر اس کے اعمال میں بے ریائی و خلوص نہیں۔ اگر دل پاک نہیں۔ نفس سرکش قابو میں نہیں تو دانش نورانی۔ معرفت الٰہی۔ صفائے باطن۔ جلائے قلب حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فلسفہ و حکمت عقل و دانش اس کی آنکھوں پہ پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور وہ اَلْعِلْمُ حِجَابٌ اَکْبَرٌ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

دل ہے مسلماں تیرا نہ میرا　　تو بھی نمازی میں بھی نمازی

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی　　حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　تری خودی کی نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار　　شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری　　فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

یہ نفس لعین و سرکش بڑے سے بڑے عابد و متقی کو بہکاتا ہے۔ طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا ہے۔ جب تک انسان اپنے نفس و پندار کے بت کو توڑ کر پاش پاش نہ کر دے اسوقت تک نہ اس کو نماز میں لطف آئے گا نہ عبادت میں مزہ ملے گا نہ ریاضت و مجاہدہ میں ذوق و شوق حاصل ہوگا۔ نہ حق گوئی و بیباکی پیدا ہوگی نہ ماسوا اللہ کا خوف دل سے دور ہوگا۔ نہ عمل و ذوق عمل پیدا ہوگا۔ نہ اس کی آواز میں دلیری و بیباکی ہوگی نہ اس کی تکبیر میں قوت و تاثیر ہوگی۔ نہ اس کے کردار میں رندانہ جرات اور بیباکانہ سرمستی ہوگی۔ اس کا دل نور الٰہی سے محروم اس کا قلب معرفت الٰہی سے بے فیض رہے گا۔ ایمان کامل نہ ہوگا۔ ایقان حاصل نہ ہوگا۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے تری دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب رندانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

ریاضت و مجاہدہ کے باوجود سکون خاطر، طمانیت قلب اور جمعیت دل کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ اور کیوں اندرونی بےچینی و پریشانی برابر قایم رہتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو روشن کرے۔ روح کو زندہ اور طاقتور بنائے۔ اپنے نفس کا عرفان اور اپنی حقیقت کا وجدان حاصل کرے۔ تمام بندگان خدا خاصان الٰہی اور اولیاء اللہ کا یہی مسلک و طریقہ رہا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی اور تعلیمات سے اقبال سب سے زیادہ متاثر و مستفید تھے۔ انھیں سب کچھ پیر رومی سے حاصل ہوا۔ دوسروں کو بھی ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں

ترا نیاز نہیں آشنائے راز ابتک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز ابتک
گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز ابتک — کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

مسلمان اور مرد مومن کی آنکھ، اس کا قلب، اس کی روح احکام الٰہی کی پابند ہوتی ہے۔ اس کا کوئی قدم خلاف شریعت نہیں اٹھتا۔ مومن و مسلمان کی تعریف اقبال سے سنئے:-

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

یہ تمام بزرگی و برتری یہ پاکیزگی و قدسی نفسی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب دل و نظر دونوں پاک ہو جائیں۔ نفس امارہ نفس مطمئنہ بن جائے۔ اسی نفس مطمئنہ کا نام قلب سلیم اور دل زندہ ہے۔ اسی قلب مومن کے واسطے حدیث شریف میں آیا ہے قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ تَعَالیٰ۔ مومن ہی کا قلب مہبط اسرار الٰہی اور مخزن انوار و تجلیات بن سکتا ہے۔ یہی قلب سلیم اور دل زندہ پیدا کرنے کے بعد صحابۂ کرامؓ۔ اولیائے عظام اور مردان خدا نے کیسے کیسے بلند مراتب پائے اور تمام عالم پر ظاہری و باطنی حکومت کی۔ اسی کی وجہ سے ان کو یہ بزرگی یہ شرف یہ قدسیت اور یہ رفعت و منزلت حاصل ہوئی۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے — ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلب سلیم

دل بیدار فاروقیؓ دل بیدار کراریؓ — مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دل بیدار کر پیدا کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

(۳)

عرفان خودی۔ سلامتیٔ قلب اور زندگیٔ دل حاصل کرنے والے کا نام مومن، مسلمان، مرد خدا، پیر طریقت اور مرشد کامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ درجۂ رفعت و منزلت۔ سربلندی و اعزاز کیونکر حاصل ہو سکتا ہے جسکے واسطے اقبال نے اس شد و مد سے ترغیب و تحریص کی ہے۔ اقبال کا پیام عمل کرنا ہے۔ خالی وعظ و نصیحت نہیں ہے۔ انھوں نے اس کے حصول کا ذریعہ بھی بتایا ہے کہ بغیر نفس کشی۔ تزکیہ باطن۔ پاکیٔ فطرت اور صفائے قلب و نظر کے ہر چیز بیکار اور بے فائدہ ہے۔ حتیٰ کہ نماز و روزہ حج و زکواۃ بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے۔ دل زندہ۔ قلب سلیم اور چراغ روشن کے حاصل کرنیکے لئے ایسے خضر طریقت۔ رہبر شریعت اور مرد کامل کی ضرورت ہے کہ جس کا دل روشن، ضمیر پاک، روح بیدار اور سینہ انوار و تجلیات الٰہی سے معمور ہو۔

چراغ زندہ می خواہی در شب زندہ داران نہ — کہ بیداری بخت از بخت بیداراں شود پیدا

مولانا روم فرماتے ہیں کہ بغیر ظل پیر اور مرشد کامل کی مدد و توجہ کے نفس قابو میں نہیں آسکتا۔ روح بیدار نہیں ہو سکتی :۔

ہیچ نکشد نفس راجز ظل پیر ذامن آں نفس کش را سخت گیر

اقبال بھی پیر و مرشد۔ رہبر طریقت اور بندہ مومن کی خدمت میں حاضر ہونیکی ترغیب دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مردان خدا اور خاصان الٰہی کی صحبت حاصل کرو۔ ان کی خدمت میں جاؤ۔ اور اپنے آپ کو مع اپنے ارادے اور قصد و نیت کے ان کے حوالے کر دو۔ اس لئے کہ:۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکی زور بازو کا نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ان کے نفس گرم اور نگاہ کیمیا اثر سے معصیت و آلودگی۔ نفسانیت و جسمانیت۔ خواہش و حرص جل کر فنا ہو جائے گی۔ اور تم میں بھی وہی سوز دروں اور جذب اندروں پیدا ہو جائے گا۔

شو ہمدم پروانہ تا سوختن آموزی با سوختگاں بنشیں شاید کہ تو ہم سوزی

اقبال چونکہ خود مرید تھے اور مدارج سلوک طے کر چکے تھے اسلئے فرماتے ہیں:۔

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربار شہنشہی سے خوشتر مردان خدا کا آستانہ

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری

خرقہ پوش درویش اور گلیم بردوش فقیر کی شان و قدرت۔ کیفیت و حالت اقبال سے

سنئے جو خود قلندر و فقیر تھے :-

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس انکی — الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو — یدبیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اقبال صرف مرد کامل اور بندۂ مومن کی صحبت ہی کی تلقین نہیں کرتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مرشد کامل کی آستانے کی خاک کو بوسہ دو - ان کے قدموں میں اپنا سر رکھو - پندار خودی - نخوت و تکبر کو دماغ سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دو تب وہ گوہر یکتا اور اکسیر اعظم حاصل ہوگا جو تمہیں کندن بنا دیگا -

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشم نوحےؑ قلب ایوبےؑ طلب
کیمیا پیدا کن از مشت گلے — بوسہ زن بر آستان کاملے
شمع خود را ہمچو رومیؒ بر فروز — ردم را بر آتش تبریز سوز
دل ز عشق او توانا می شود ! — خاک ہمدوش ثریا می شود !

اقبال مرد مومن پیر صادق اور مرشد کامل کی خدمت و صحبت کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی نشانی اور اس کے اوصاف بھی بتاتے جاتے ہیں ہر صاحب خرقہ و کلاہ جبہ و قبا پہنے ہوئے مرد مومن نہیں ہوتا - صوفی الگ چیز ہے اور مومن الگ - صوفی تو مومن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا -

اسکا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا — اسکے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی — وہ پاکی فطرت سے ہوا محرم اعماق

صوفی صرف تسبیح وسجادہ کا پابند ہوتا ہے۔ اس میں ملکوتی صفات، لاہوتی قوت، آفاقی جبروت نہیں ہوتی۔ اس کا دل سوز ورقت سے محروم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

لا الہ را بگو از روے جاں　　تا ز اندام تو آید بوے جاں

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری　　رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ　　نہیں ممکن امیری بے فقیری

صوفی کی کیفیت بھی سن لیجیے:۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　ملاّ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کے رگ وپے میں فقط مستیٔ کردار

اسداللّٰہی فقر۔ بیداری خودی اور روشن ضمیری کا نام اسلام ہے۔ اسلام کی روح اسی سے زندہ تھی اور یہی اصلِ تصوف، نہایت ایمان اور حقیقت اسلام ہے۔

روح اسلام کی ہے نور خودی نار خودی　　زندگانی کیلئے نار خودی نور وحضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصل نمود　　گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر　　دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقر غیور"

طالب صادق اپنے آپ کو اس رہبر کامل اور خضر طریقت کے سپرد کرتا ہے وہ اس مرید صادق کو ذکر حق کی تلقین کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ لِکُلِّ شَیٍٔ مِصْقَلَۃٌ وَمِصْقَلَۃُ الْقَلْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی (ہر شئے کی ایک

قلبی ہے قلب کی قلبی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔) ذکرِ حق ہی وہ اسم اعظم ہے جو مسِ آدم کو اکسیر اعظم بنا دیتا ہے۔ اقبال اس ذکرِ حق اور اسم اللہ کی تاثیر کے متعلق فرماتے ہیں:-

نہ با ملاّ نہ با صوفی نشینم　　　تو می دانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بہ لوحِ دلِ من　　　کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

وہ رہبر کامل اس مرید صادق کے معصیت و گناہ کے زنگ کو ذکرِ حق کی کٹھالی میں ڈال کر دور کرتا ہے۔ نفسانی وسواس اور شیطانی خطرات کے خس و خاشاک کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ دل سے گناہوں کی سیاہی اور بداعمالی کی تاریکی کو دور کر کے نور ایمان اور معرفت الٰہی سے روشن و تاباں بنا دیتا ہے۔

اسی کو اقبال فرماتے ہیں:-

دمِ عارف نسیم صبح دم ہے　　　اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر　　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اس مرید صادق کا دل انوار الٰہی اور اسرار ربانی کو قبول کرنے کے قابل بنجاتا ہے۔ اس کی رفتار ترقی مدارج علیا کی طرف نہایت تیز ہوتی ہے اور وہ اپنے مرشد کی رہبری و دستگیری میں نہایت سرعت سے آناً فاناً مدارج سلوک طے کرتا ہوا محبت رسولؐ کے بلند ترین درجہ پر سرفراز ہو جاتا ہے۔ عشق رسولؐ ہی اصل اسلام غایت تصوف اور منتہائے ایمان ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مدارج عشق طے کرنے کے لئے عرفان خودی کے استحکام کے لئے کامل و اکمل بننے کے واسطے عشق رسولؐ اور اتباع نبوی لازم ہے۔ اتباع اور پیروی بغیر عشق و محبت کے نہیں ہو سکتا ہے۔ آپؐ کی ذات گرامی سے از بس عشق ہونا چاہیے کہ تمام دین و ایمان کی تکمیل اور بندہ مومن کی تعمیر یہیں ختم ہوتی ہے۔ جب محبت رسولؐ اس کے دل میں راسخ ہو جائے تو دین و دنیا اس کے ادنیٰ خادموں میں شامل ہیں۔ آپؐ کی علوشان کا حال اقبال کی زبان سے سنیئے:۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰؐ است ۔ آبروئے ما ز نام مصطفیٰؐ است
طور موجے از غبار خانہ اشؐ ۔ کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اشؐ
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد ۔ کاسب افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنون خواب راحتشؐ ۔ تاج کسریٰ زیر پائے امتشؐ
ماند شبہا چشم او محروم نوم ۔ تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز ۔ دیدۂ او اشکبار اندر نماز

از کلید دیں در دنیا کشاد
ہمچو او بطن ام گیتی نزاد

جب سالک راہ اور جویائے حق محبت رسولؐ میں فنا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو رنگ محمدیؐ میں رنگ لیتا ہے۔ اس کی روح اس کی نظر اور قلب و جگر سب عشق رسول سے متکیف ہو جاتے ہیں۔ اس کی خودی مادیت جسمانیت اور شیطانیت سے آزاد ہو کر فضائے آسمانی میں پرواز کرتی ہے۔ خودی کی اصلیت و حقیقت نمودار ہو جاتی ہے۔ خودی کی قاہری و عریانی اپنی پوری

جلوہ گری کے ساتھ عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ صاحب ما شاغ اور صاحب لولاک بن جاتا ہے۔ اس کے دل کی وسعت و قدرت کا اندازہ وہم و خیال سے بالاتر ہے۔

قصۂ دار و رسن بازی طفلانۂ دل التجائے ارنی سرخی افسانۂ دل

نقطۂ نورے کہ نام او خودی زیر خاک ما شرار زندگی
از محبت می شود پایندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش ارتقائے ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق عالم افروزی بیاموزد ز عشق

یہ بندہ اس مقام پہ پہنچ کر بندہ مومن بن جاتا ہے۔ اس میں خدائی صفات ملکوتی شان اور لاہوتی قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں وہ انسان اور ہم ہی جیسا انسان نظر آتا ہے لیکن اس کی اندرونی طاقت باطنی جذب و قوت۔ عشق و جنوں۔ التہاب و سوزش کا اندازہ جو عشق رسولؐ اور عشق الٰہی کی بدولت حاصل ہوا کسی عنوان عقل انسانی میں نہیں آسکتا۔ اس مقام کے متعلق اقبال کہتے ہیں:۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جسمیں ہی بے پردہ روح قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہی قادری اپنی یہی مقام ہی کہتے ہیں جسکو سلطانی
یہی مقام ہی مومن کی قوتوں کا عیار اسی مقام سی آدم ہے ظل سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہی یہ عشق و مستی ہے کہ جبر و قہر سی ممکن نہیں جہانبانی

یہی عشق الٰہی تھا کہ :۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا باعث بھی یہی عشق تھا کہ باوجود اس کے کہ آپ نے اتنے خوفناک ہیبتناک مظالم برداشت کئے پھر بھی برضا و رغبت جام شہادت نوش فرمایا۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہ عشق جسم و روح ظاہر و باطن اور رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس میں بے پناہ قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفےٰ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

عشق کی قوت و جبروت کا منبع و مصدر وہی محبت رسولؐ ہے جو اس مرد مومن کو لاتعداد قوتوں اور بے پناہ طاقتوں کا مالک بنا دیتی ہے۔

می نہ دانی عشق و مستی از کجاست این شعاعے ز آفتاب مصطفےٰ است
زندۂ تا سوز او در جان تست این نگہ دارندۂ ایمان تست
باخبر شو از رموز آب و گل بس بزن بر آب و گل اکسیر دل
دل ز دین سرچشمۂ ہر قوت است دین ہمہ از معجزات صحبت است

(۴)

انسان مرد مومن اس وقت بنا جب اس نے اپنی ذات کو مادیت و جسمانیت کی تمام آلودگی سے پاک و صاف کر لیا۔ اب وہ صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی ذات تمام انسانوں سے مقدس و بالاتر ہوگئی۔ اس کی روح جو لاہوتی الاصل تھی اور نفس و شیطان کے شکنجہ میں گرفتار ہو کر اس کی اصلی قوت و پرواز ختم ہو گئی تھی پھر منزہ و مصفا ہو کر اپنی اصلی حالت پہ آگئی۔ اب اس کی قوت پرواز اور ہوائے سیر، فضائے لامکانی پہ محیط ہو گئی۔ جس کی نہ کوئی جہت نہ مکان۔ نہ کوئی حد نہ غایت۔ آج تمام عالم میں روح و دل کی اس مردنی سے ہر چیز کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے۔ دنیا کے ہر اصول و فروع اور ہر آئین و صنف میں اقبال کو اسی کے فقدان کی وجہ سے ابتری و تباہی نکبت و فلاکت نظر آتی ہے۔ باوجود مادیت کی اس درجہ ترقی کے انھیں وہ جوہر اصلی اور وہ شان جمال نظر نہیں آتی جو ہونی چاہیئے تھی۔ اور جو ان قرون میں موجود تھی جبکہ مسلمان اسلام کے احکام پر عمل کرتے اور اسوۂ حسنہ کے پابند تھے۔

یہ مرد مومن ان بے پناہ طاقتوں اور لاتعداد قوتوں سے متصف ہو کر میدان عمل میں آتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر باب اور اس کا ہر قدم ایک نئے انداز سے کھلتا ہے اور ایک انوکھے طریقہ سے اٹھتا ہے۔ اس کا براہ راست تعلق خداوند تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ کوئی حجاب و پردہ درمیان میں حائل نہیں۔ وہ ایک مجسم عمل، مسلسل اضطراب اور مکمل سوز

ہوتا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اس کی ذات ہر شر و فساد۔ بلیات آسمانی اور حادثات ناگہانی سے مصئون و مامون ہوتی ہے۔ جو خود اس دنیا کے واسطے باعث نزول خیر و برکت ہوتا ہے۔ اس کے دم سے بلاہائے آسمانی ٹل جاتی ہیں۔ اس کی دعا سے بارشیں ہوتی ہیں۔ اور گناہگاروں پہ رحمت یزدانی نازل ہوتی ہے۔ اس کے وجود سے خداوندی انعام اور ربانی فضل اور سبحانی انوار کی بارش ہوتی ہے۔ اور انہی قدسی نفوس کے واسطے حدیث شریف میں ہے وَبِهِمْ تُرْزَقُوْنَ وَبِهِمْ تُمْطَرُوْنَ وَبِهِمْ تُعِيْشُوْنَ (یہی لوگ ہیں کہ جنکے طفیل میں تم کو رزق دیا جاتا ہے۔ تم پر بارش ہوتی ہے۔ اور تم زندگی گذارتے ہو)

مرد مومن کی فہم و فراست، ادراک و دانش کی گہرائی و گیرائی کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ علم لدنی سے سیراب ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ کی قوت کسی پردے اور حجاب کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی۔ وہ دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور خدائی کانوں سے سنتا ہے۔ ہر چیز کی اندرونی ہیئت و غایت پہ اس کی نگاہ پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ. فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ ۝ (مومن کی فراست و دانائی سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ لیتا ہے۔) اقبال کہتے ہیں:۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اسکی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھکو تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحب آفاق

اس کی خودی کی اصلی قوت اور حقیقی طاقت آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کی سلطنت و شہنشاہی اس دنیائے آب و گل سے بھی ماورا تک ہوتی ہے۔ زمین و آسمان چاند سورج اس کے اشاروں پر رقص کرتے ہیں۔ اس کی ذات سے انکا وجود و قیام ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوقات اپنے اعمال اور اپنے شب و روز کا حاکم ہوتا ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

ابن الوقت کے ادنیٰ مقام سے گذر کر ابو الوقت اور ابو الحال کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا حاکم اور قیوم زماں ہوتا ہے۔ اقبال سے اس مرد مومن کی کیفیت۔ طاقت و قدرت۔ شان و شوکت کا حال سنیئے۔

رمز دین مصطفیٰ دانی کہ چیست فاش دیدن خویش را شاہنشہی است
چیست دین دریافتن اسرار خویش زندگی مرگ است بے دیدار خویش
آں مسلمانے کہ بیند خویش را از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست تیغ لا موجود الا اللہ اوست
در مکان و لامکاں غوغائے اُو نہ سپہر آوارہ در پہنائے اُو
تا دلش سِرّے ز اسرار خداست حیف اگر از خویشتن ناآشناست
بندۂ حق وارث پیغمبراں او نگنجد در جہان دیگراں
تا جہانے دیگرے پیدا کند این جہان کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیر حق دارد فراغ از خودی اندر وجود او چراغ
فطرت او بے جہات اندر جہات او حریم و در طوافش کائنات

مومن حیات ابدی اور زندگیٔ جاوید کا مالک ہوتا ہے۔ موت اس کے واسطے اک نقل مکان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اسمیں وہی قوت عمل اور وہی طاقت پرواز باقی رہتی ہے جو اس دنیا میں تھی۔ اس کی قوت وصل محبوب اور قرب حق سے دوگنی اور چوگنی ہو جاتی ہے۔ موت کا کوئی خوف وہراس اور کوئی اثر اس پہ نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک بہانہ ہوتی ہے اس کو محبوب سے قریب تر کر دینے کا۔ اقبال کہتے ہیں:۔

نشان مرد مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

خودی کی زندگی، دل کی بیداری اور عرفان نفس سے مومن میں غیر فانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ فنا اور زوال سے مبرّا ہوتا ہے۔ اس کی حکومت دنیا کی ہر کام اور ہر شعبہ میں بدستور جاری و ساری رہتی ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

بندۂ مومن مرنے کے بعد قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید نہیں ہوتا ہے۔ اس کی قبر تو محض دنیا کے لئے ایک نشان ہوتی ہے۔ اس کا قیام و مکان تو جوار حق میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو بدستور دیکھتا ہے اور اسی طرح اس کے تمام کام جاری رہتے ہیں۔ جو لاہوتی طاقتیں اور ملکوتی صفات اس میں پیدا ہو گئی تھیں وہ اور زیادہ چمک اٹھتی ہیں۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے

مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس
مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

موت کا فرشتہ بھی مومن کی خودی تک نہیں پہنچ سکتا۔ فرشتہ کی وسعت و رسائی آسمان و زمین تک محدود ہوتی ہے اور مومن کی رسائی ان مقامات تک ہوتی ہے "جن کا نہیں کوئی نام"۔ مومن کی عقل و دانش خداوندی ہوتی ہے۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔ حجاب اس کے لئے ایک لفظ بے معنی ہے۔ اس کا دل جام جم سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔ ہر چیز کا عکس اس کے ارادہ و خواہش سے اس کے اندر منعکس ہوتا ہے۔ وہ صرف اس دنیائے آب و گل اور فضائے نیلگوں کا مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ ان زمانوں کا بھی "جن کا نہیں کوئی نام" مالک ہوتا ہے۔ اور جس کی خودی بیدار نہیں وہ اسی آب و گل کے طلسم میں گرفتار رہتا ہے اور اسی کو فضائے لامکان تصور کرتا ہے۔ اور اس کی خودی اسی قید میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

اقبال مومن کی ایک خوبصورت پہچان اور اس کا مقام بتاتے ہیں۔

کل ساحل دریا پہ کہا خضر نے مجھ سے
تو ڈھونڈ رہا ہے سم افرنگ کا تریاق

اک نسخہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مومن محبت رسول صلعم و عشق الٰہی میں سرشار و متکیف ہو کر تمام مادیت و کثافت سے مبرا ہو گیا۔ اس کا ہر قدم اور ہر فعل سنت رسول صلعم کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اسکا

دل انوار الٰہی اور مشاہدۂ حق سے پر نور ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خوف خدا ہوتا ہے۔ اور ماسوا اللہ کا خوف اس کے قریب بھی نہیں آتا۔ اس کی آواز میں دلیری و بیباکی اثر و قوت ہوتی ہے۔ اس کے اندر جذب، تڑپ، سوز اور گرمی ہوتی ہے۔ تجلیات الٰہی کے مشاہدہ سے اس کی تیرہ شبی روشن ہو جاتی ہے۔ اور انوار و برکات الٰہی سے فروغ صبح فروغ پاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مومن تمام ارکان اسلام کا پابند ہوتا ہے۔ اس کی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکواۃ انوار الٰہی کی روشنی سے اس کی قلب کی گرمی سے فروغ و جمال پاتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروزست حج ہجرت آموز وطن سوزست حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے ربط اوراق کتابے ملتے
حب دولت را فنا سازد زکواۃ ہم مساوات آشنا سازد زکواۃ
دل ز حتی تنفقوا محکم کند زر فزاید الفت زر کم کند

این ہمہ اسباب استحکام نست
پختۂ محکم اگر اسلام نست

مومن کی نماز تو سراپا عشق ومحبت ذوق وشوق ہوتی ہے۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ نہ نماز میں ذوق نہ روزہ کا شوق نہ احکام الٰہی کی پابندی اور نہ اسوۂ حسنہ کی متابعت۔ دل پراگندہ طبیعت پریشان۔ قلب دنیاوی علائق میں گرفتار۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدہ بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

جواب شکوہ میں اقبال مسلمانوں کی حالت واعتقاد وایمان کے متعلق کہتے ہیں:۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے تم ہی کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے

جب لا الٰہ کا نقش دل سے محو ہو کر اِلٰهُهٗ هَوٰاهُ کا نقش مرتسم ہوگیا تو نہ دین باقی رہا نہ دنیا۔ غلامی ونحوست طاری ہوگئی:۔

مومن و پیش کساں بستن نطاق مومن و غداری و فقر و نفاق
با پشیزے دین وملت را فروخت ہم متاع خانہ را ہم خانہ سوخت
لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوات او نماند جلوۂ در کائنات او نماند
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ فتنۂ او حب مال و ترس مرگ
رفت ازو آں مستیؔ و ذوق و سرور دین او اندر کتاب و او بگور
صحبتش با عصر حاضر در گرفت حرف دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات رفت جاں از پیکر صوم و صلوات

روح چوں رفت از صلوات و از صیام فرد ناہموار ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امید بہی

مرد مومن ہمہ وقت معرفت الٰہی و مشاہدۂ اسرار الٰہی میں سرشار رہتا ہے۔ تجلیات و انوار کی مسلسل بارش اس پہ ہوتی رہتی ہے۔ اس کی ذات ذاتِ الٰہی میں فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی گفتار و رفتار۔ افعال و کردار۔ قصد و ارادہ اور ہر حرکت و فعل منجانب اللہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ خداوندی طاقت و قوت کی مکمل و زندہ تصویر ہوتا ہے۔ ان نسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین کی زندہ شرح و تفسیر ہوتا ہے۔ اقبال نے یہ شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اسی مرد مومن کی شان میں کہا ہے۔ نیز فرماتے ہیں:۔

تابع حق دیدنش نادیدنش خوردنش نوشیدنش خوابیدنش
در رضایش مرضی حق گم شود "ایں سخن کے باور مردم شود"

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی ہے اسکا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرود ازلی اسکے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان
بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم — لے اپنی مقدر کی ستارے کو تو پہچان

اسرار ربانی اور انوار الٰہی میں سرشار و متکیف ہو کر مومن کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اس کی ہر آن و شان بدل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ طرز گفتگو اور طریقہ کلام بھی سب سے جدا و نرالا ہوتا ہے۔ نہایت سادہ و آسان الفاظ میں گفتگو کرتا ہے۔ اور ان چند الفاظ میں معانی و مطالب کے بے پناہ اسرار و غوامض پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسکی ہدایت و تلقین اس کا فرمان و ارشاد تمام تر قرآنی اسرار و احکام الٰہی اور احادیث نبویؐ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا انداز گفتگو اپنے اندر ایک نئی شان و کیفیت رکھتا ہے۔ اس کی صحبت میں عجیب روحانی لذت اور سرمدی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مضمون ہوتا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اس کے لطف و عنایت، قہر و غضب میں بھی ایک جمالی کیفیت اور جلالی شان ہوتی ہے۔ یہ لطف و قہر اس کے کسی نفسانی جذبہ کے ماتحت نہیں ہوتا۔

اسکی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق — قہر بھی اسکا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
انجمن میں بھی میسر ہے خلوت اس کو — شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق
اسکا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا — اسکے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

اسی لئے اقبال نے کہا ہے:۔

ترستی ہے نگاہ نارسا جسکے نظارے کو — وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں

مومن کا دل مہبط انوار الٰہی اور مخزن اسرار و رموز ہوتا ہے۔ تمام عالم اس کے زیر نظر و فرمان ہوتا ہے۔ اس کا دل جام جم ہے۔ اسے مکمل استغنا اور مطلقاً بے نیازی حاصل ہوتی ہے۔ دنیاوی جاہ و ثروت، ظاہری رعب و جلال، بیرونی نمود و نمائش اسے مرعوب و مغلوب نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے افعال و کردار کا فاعل مطلق ہوتا ہے۔ اگرچہ حقیقی فاعل مطلق خداوند تعالیٰ کی صفت ہے لیکن جب بندہ اس کا بن جاتا ہے اس کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے تو یہی صفت اسکے اندر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

پیش ازیں نور ار بمانی استوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
مرد حق از کس نہ گیرد رنگ و بو — مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر — ہر زماں او را بحق شانے دگر

وہ قوت الٰہی کی مدد سے اور انوار خداوندی کی روشنی میں سیر کرتا ہے۔ تمام عالم اسکے بال و بازو کے نیچے ہوتا ہے۔ اسکی پرواز فضائے لامکانی میں ہوتی ہے جو کسی حدود مکان کی پابند نہیں ہوتی۔ ارض و سما، لوح و قلم، عرش و کرسی سے بھی بلند تر اسکا مقام ہوتا ہے

بزیر کنگرہ کبریائش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار دیزداں گیر

اقبال کہتے ہیں:-

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرماندہ عالم شود
ہمچناں از خاک خیزد جان پاک — سوے بے سوئی گریزد جان پاک

در رہ او مرگ و حشر و حشر و مرگ
جز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضائے صد سپہر نیلگوں
غوطہ ہم خوردہ باز آید بروں
می کند پرواز در پہنائے نور
مجلسش گیرندہ جبریل و حور
تا ز ما زاغ البصر گیرد نصیب
بر مقام عبدہٗ گردد رقیب

مومن حصول رزق جلب منفعت کسب زر سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ کسی بادشاہ و امیر کے دربار کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ وہ اپنے فقر غیور میں مست رہتا ہے۔ وہ دنیاوی حادثات ارضی مشکلات، عسرت و افلاس کا گلہ مند نہیں ہوتا۔ اسکا فقر غیرت مند ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی رزاقیت پر اسے کامل یقین اور پورا ایمان ہوتا ہے۔

خود دار نہ ہو فقر تو ہے قہر الٰہی
ہو صاحب غیرت تو ہے تمہید امیری
افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

فقر غیور اور فقیری (گدائی) میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی
اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی
در معرکہ بے سوز تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی، تو کجائی

مومن اس ایمان و ایقان کی برکت سے بادشاہ و امیر کے احسان سے سبکدوش رہتا ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ اس کے آستانے پر حاضر ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کے دربار میں نہیں جاتا۔ جب اس کو احکم الحاکمین کا آستانہ حاصل ہوگیا

تو پھر بھلا وہ ان دنیاوی بادشاہوں کو کیا نظر میں لا سکتا ہے۔ اکسیر اعظم اور اسم اعظم تو خود اس کے ناخنوں میں پڑے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی سلطنت کو ایک چشم زدن میں قائم و برباد کر سکتا ہے۔ خاک کو اکسیر، خزف کو گوہر شاہوار بنا دیتا ہے۔

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو — لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحب یقیں
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی — وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

مرد حر محکم ز ورد لا تخف — با میداں سنر بجیب او سر بکف
مرد حر از لا الہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

اس کی بے نیازی کے متعلق کہتے ہیں:-

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مرد آزاد ست و بس — ملک و آئینش خدا داد ست و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

مومن کے قبضہ و اختیار میں ہر چیز ہوتی ہے۔ قوموں کی تقدیر۔ ان کا عروج و زوال اور شوکت و اقتدار اس کی ایک جنبش نگاہ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک لمحہ میں وہ گدا کو امیر اور امیر کو گدا بنا سکتا ہے۔

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر — تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش — جس نے نہ دیکھی سلطاں کی درگاہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا — نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری مومن ہی تو کرتا ہی فقیری میں بھی شاہی

مومن شکم پروری اور تن آسانی کی خواہشات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کا استغنا اور بے نیازی اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ جس پہ ہزار دولت و تونگری قربان ہی۔

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اور اس بے نیازی کی بدولت اسے وہ قوت و جبروت وہ رندانہ جرات و بیباکی حاصل ہوتی ہے جو کسی رعب و جلال سے دب نہیں سکتی۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پہ بیباکی کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ اور اس کے دل میں کسی خوف و خطرہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک اور پہچانے تو ہیں تیری گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہی دل یا شکم

نیز فرماتے ہیں:۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی!
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

یہی استغنا و بے نیازی، یہ شان درویشی اور فقر غیور اقبال کو بھی حاصل تھا۔ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ کوئی خود خلوص و نیاز سے کچھ تحفہ پیش کرتا تو قبول کر لیتے۔ یوم اقبال کے موقعہ پر نظام حیدر آباد کی شاہی توشہ خانہ سے جو اس زمانہ میں سر اکبر حیدری صدر اعظم کے ماتحت تھا بطور عطیہ و تواضع ایک ہزار روپئے کا چیک اقبال کو بھیجا گیا تھا۔ اقبال کی غیرت نے اس کا قبول کرنا گوارا نہ کیا اور ذیل کا قطعہ چیک کی پشت پر لکھ کر واپس کر دیا۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ہلاکو کا صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر! — حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

یہی رندانہ جرات و بیباکی جو دل کی صفائی، روشن ضمیری، پاکی نفس، خشیت الٰہی اور عشق رسولؐ سے حاصل ہوتی ہے آج ہم میں سے مفقود ہے اور جس شخص کو یہ حاصل ہو جاتی ہے اس میں وہ تمام قوتیں اور صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو مومن میں

ہوتی ہیں ۔ لیکن ہمارے دل و دماغ، قلب و نظر، ہوش و خرد، حس و حواس سب فرنگی تہذیب مغربی تعلیم میں اسقدر رنگے جا چکے ہیں کہ ہم ان باتوں کو فوق الفطرت خیال کرتے ہیں ۔ خدا اور رسولؐ سے صرف نام کا تعلق باقی رہ گیا ہے ۔

ہوا ہی بندۂ مومن فسونیٔ افرنگ — اسی سبب سی قلندر کی آنکھ ہی نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب — کہ ان کی واسطے تونی کیا خودی کو ہلاک
مگر یہ بات چھپائی سی چھپ نہیں سکتی — سمجھ گئی ہی اسی ہر طبیعت چالاک
"شریک حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے — خریدتی ہیں فقط ان کا جوہر ادراک"

فقدان غیرت و خودداری و حمیت و عزت اور مرگ خودی کی بدولت ہی یہ نکبت و فلاکت یہ ذلت و رسوائی اور غلامی و محکومی ہمیں حاصل ہی ۔ ہماری یہ زبوں حالی اور پستی صرف اس لئے ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن نے ہمیں تن آسان عیاش اور روباہ مزاج بنا دیا ہے ۔ ہم میں سے قوت عمل، ذوق کردار، محنت و جفاکشی کم ہوتے ہوتے مفقود ہو گئی ۔ ہماری طبیعت میں فولادی طاقت کی بجائے نرمی و حریری پیدا ہو گئی ۔ کہسار کی خلوت اور بیابان کی صحبت سے وحشت ہونے لگی ۔ اسی وجہ سے اقبال نے اپنے پیام میں "تعلیم خود آگاہی" کا مسکن کہسار کی خلوت کو قرار دیا ہے ۔ جہاں طبیعتوں میں جوش و قوت خود بخود اس سادہ اور بے لوث ماحول سے پیدا ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے وہ بندۂ مومن کو شاہین اور باز سے خطاب کرتا ہے کہ شاہین کبھی قوت عمل ۔ کوشش و محنت سے نہیں گھبراتا ۔ اس کی طبیعت میں سکون و آرام کی خواہش پیدا نہیں ہوئی ۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بے جرات رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جسکا وہ عشق یداللٰہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردک میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی
یہ حسن و لطافت کیوں وہ قوت و شوکت کیوں
بلبل چمنستانی شہباز بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و سلمانیؓ

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اسکا
تلوار ہے تیزی میں صہبای مسلمانی

اس بے نیاز و بے لوث ماحول کی زندگی بھی بے لوث و بے نیاز ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت میں سادگی، طاقت و قوت ہوتی ہے۔ عمل اسکا لباس اور تلوار اس کا زیور ہوتی ہے۔ یہی تلوار تھی جس کی برّش و تیزی نے کفر و باطل کا خاتمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ جس نے مسلمان کو عز و وقار، قوت و جبروت دی تھی۔ جب اس تلوار کے قبضہ پہ ہاتھ نہیں رہا۔ جب دل سے **لا شریک لہ** نکل گیا۔ تو محکومی و غلامی نصیب ہوئی

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد میں شمشیر جگر دار

اس بیت کا یہ مصرع اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرع ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضہ میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

اقبال کا تنوع

از

جناب ظہیر الدین احمد صاحب علوی ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

استاد شعبہ اردو۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اقبال کی شاعری کا آغاز داغ کے رنگ میں ہوا۔ لیکن اقبال کا کائناتی تخیل اور وسیع نقطۂ نظر اس محدود آب و گل سے نکل کر غالب کے طرزِ کو قبول کر رہا تھا اس لئے کہ داغ کی صنّاعی اور مرصع کاری حقیقتاً ایسی بازی گری تھی جس میں فلسفی منش دماغ اور دور رس ذہن زیادہ دنوں تک بالیدگی نہیں پا سکتا تھا۔ اقبال کے حیاتی مسائل اور عمیق افکار کی سمائی دماغ کے پرانے آبگینے میں مشکل تھی۔ کیونکہ یہ الفاظ کی تندی اور خیالات کی تیزی سے پگھلا جا رہا تھا۔ اقبال کی اس افتادِ طبیعت نے ان کو کسی غور و فکر کرنے والے شاعر کی طرف رجوع کیا۔ جہاں محض رسمی ناؤ نوش سے کچھ زیادہ سامان مل سکے۔ اس پیمانے پر غالب پورے اترتے تھے۔ کیونکہ ان کا طرز بھی فلسفیانہ اور جاندار تھا۔ وہاں انھیں بہت سے ایسے بنے بنائے سانچے مل گئے جن میں ڈھل کر خیالات ان کے مقصد کو پورا کر سکتے تھے۔ اقبال کو بھی ہر بڑے شاعر کی طرح اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نئی نئی ترکیبیں وضع کرنی پڑیں اور در اصل یہ ایک مستحسن امر ہے کیونکہ اس سے اردو زبان میں گرانقدر اضافہ

ہوتا جا رہا ہے۔ آئیے چند ایسی تراکیب کا جائزہ لیں جس سے اقبال کی جدت طبع اور ندرت وضع کا ثبوت ملے۔ پانچ اشعار ملاحظہ ہوں جو بے ترتیب اخذ کر لئے گئے ہیں۔

تغیّر آگیا ایسا تدبّر میں تحمّل میں
نہیں سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

آسماں مجبور ہی شمس و قمر مجبور رہیں
انجم سیماب پا رفتار پہ مجبور رہیں

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہی کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایّام ہیں

ذی مجال شکوہ ہی ذی طاقت گفتار ہی
زندگانی کیا ہی اک طوقِ گلو افشار ہی

جگر چاکی۔ انجم سیماب پا۔ طلسم دوش و فردا۔ ماتم خانۂ برنا و پیر۔ دختران مادر ایام۔ طوق گلو افشار کی تراکیب قابل غور ہیں۔ ان کی جامعیت۔ ندرت اور واقعیت داد طلب ہے۔ عموماً غنچوں کو شگفتہ ہونے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اقبال ایک نئے انداز میں ان کے ہنسنے کو رونا سمجھ کر ان کو جگر چاک بتاتے ہیں۔ ستارۂ سحری کبھی ٹمٹماتا کبھی جھلملاتا نظر آتا ہے، اور شام کو ستارہ چمکتا دکھتا ہے لیکن اقبال ان سب کو نظر انداز کر کے اس کی ایک نئی فطرت یا عادت ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی اس کا سیماب پا ہونا۔ دنیا کو شاعر نے ماتم خانۂ برنا و پیر بتا کر ایک خفیہ حقیقت کو روشن کر دیا ہے۔ زمانہ کو طلسم دوش و فردا کہہ کر اور انسان کو اسمیں اسیر بتلا کر کیسی سچّی بات پیش کر دی ہے۔ اس قسم کی ہزارہا نئی ترکیبیں اقبال کے یہاں ملتی ہیں۔ جن کو پڑھ کر ان کی حیرت انگیز خلّاقی اور جدت طرازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں بلا کی جامعیت ہے۔ جہاں جہاں اقبال نے انھیں استعمال

کیا ہے اس سے بہتر اور جامع ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔

تشبیہات و استعارات اچھوتی تشبیہات کا استعمال اقبال کی شاعری میں شروع سے ہی ملتا ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے دور کی نظموں میں "جگنو" کے عنوان سے ایک نظم ہے جسمیں ان کی تشبیہات کی ندرت کا کمال صاف ظاہر ہوتا ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

جگنو کو پھولوں کی انجمن کی شمع۔ مہتاب کی کرن۔ شب کی سلطنت میں دن کا سفیر مہتاب کی قبا کا تکمہ۔ سورج کے پیرہن میں ذرّۂ نمایاں۔ چھوٹا سا چاند وغیرہ کہنا کسقدر پر از حقیقت ہے۔ تشبیہات کی طرفگی اور ندرت، کلام میں ایک غیر معمولی حسن پیدا کر دیتی ہے۔

اسی طرح مناظر قدرت کے پیش کرنے میں بھی اقبال نے نہایت نادر اور بر محل تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ مثال کے طور پر "بزم انجم" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشت افق سے لیکر لالی کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کی لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے کہتا ہے جنکو انساں اپنی زباں میں تارے

سورج کا شام کو جو سیہ لباس پہنے ہوئے ہے، طشت افق سے لالہ کے پھول مارنا اور عروس قدرت کا چاندی کا گہنا پاتا اتار کر سونے کا زیور پہننا کس قدر بلیغ اور لطیف تشبیہات ہیں۔ اقبال کو چونکہ فکر و حکمت کی گتھیاں سلجھانی تھیں۔ دلوں میں حقیقت آگاہی کا جذبہ پیدا کرنا تھا اور "اسرار و رموز" کے نکات حل کرنے تھے اس لئے انھوں نے ایسی تشبیہات استعمال کی ہیں جنکی برجستگی۔ موزونیت، واقعیت ہماری نظروں کے سامنے خیال مجرد کو لا کھڑا کرتی ہیں۔

علامہ اقبال نے تشبیہات ہی میں اپنی خلاقی اور جدت کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ بلکہ استعارات کے استعمال میں بھی انھوں نے بڑا کمال دکھایا ہے۔ ان کی نظم ماہ نو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
چرخ نے بالی اتاری ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

پہلی تاریخ کے چاند کا عکس پانی میں دیکھ کر اس کو خورشید کی کشتی کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا کہنا کتنا نادر استعارہ ہے۔ اور پھر ہلال نو کو عروس شام کی بالی کہنا طرفگی خیال اور ندرت کا کمال ہے۔ ایک دوسری مثال اور ملاحظہ ہو۔ عبد الرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں دیکھ کر جن جذبات کا اظہار زبان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

اپنی وادی سے دور ہوں میں میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا صحرائے عرب کی حور ہے تو

کھجور کے درخت کو صحرائے عرب کی حور کہنا یا اندلس میں اس کو نخل طور قرار دینا بظاہر غیر مستحسن معلوم ہوتا ہے لیکن ایک عرب کے جذبات کی عکاسی جس کی پرورش کھجور کے درختوں کے سایہ میں ہوئی ہو اس سے بہتر شاید ہی ممکن ہو۔ وہ ہر حسن اور خوبی کو انھیں چیزوں میں تلاش کرے گا جو اس کی زندگی کا جزو ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے عبدالرحمٰن کا کھجور کے درخت کو صحرائے عرب کی حور اور نخل طور کہنا کچھ بیجا نہیں۔ اقبال کے بعض استعارے مخصوص ہیں مثلاً مرد مومن کو شاہین کہتے ہیں۔ اس استعارہ کی وجہ علامہ اقبال نے خود اپنے ایک خط میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں:۔

(۱) خوددار و غیرت مند ہے کیونکہ دوسرے کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) خلوت پسند ہے۔ (۳) تیز نگاہ ہے۔ (۴) بے تعلق ہے کہ آشیاں نہیں بناتا۔ (۵) بلند پرواز ہے۔"

اقبال شاہین کی ان خصوصیات کی بنا پر مرد مسلمان کو اکثر شاہین کے نام سے پکارتے ہیں:۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں

اسی شاہین کی رعایت سے وہ کمزور یا ناتواں اور غلام انسان کو کبوتر، کنجشک، زاغ وغیرہ کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کی صحبت سے خوددار اور غیور انسان کو احتراز کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صحبت زاغ "شاہین بچوں" کو خراب کر دیتی ہے۔ کیونکہ زاغ میں نہ بلند پروازی ہوتی ہے نہ بلند نگاہی۔

جسطرح سے اقبال شاہین سے مراد مرد مومن لیتے ہیں اور اس کا اعادہ بار بار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ساقی سے مراد اللہ تعالیٰ لیتے ہیں۔ وہ بار بار ساقی اور اس کے لوازمات کا ذکر کرتے ہیں، مگر اُن کی صہبا انگوری نہیں روحانی ہوتی ہے۔ اُن کا پیمانہ بلوریں نہیں بلکہ عشق کا ہوتا ہے۔ اُن کی شراب بدمستی نہیں پیدا کرتی بلکہ نور بصیرت لاتی ہے۔ اس کا پینے والا بدکردار و بداعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ صاحب آفاق اور محرم اعماق ہوتا ہے۔

اقبال استعارہ و کنایہ کے پردہ میں بات کہنے کے بہت زیادہ دلدادہ ہیں۔ وہ سیاسی پیشواؤں کو خاکباز، ان کی خودی سے عاری پیروؤں کو "مور دمگس" اور ان کی شاطرانہ چالوں کو "عنکبوتی کمند" کہتے ہیں اور مجلس بین الاقوام کو "داشتۂ پیرکِ افرنگ" اور اس کے افراد کو "ابلیس کے فرزند" کا نہایت موزوں اور معنی خیز نام دیتے ہیں۔ ابی سینیا پر چڑھ دوڑنے اور غارتگری روا رکھنے والوں کو "یورپ کا گرگس" اور مفتوحہ ابی سینیا کو "لاش" اور "مردۂ دیرینہ"۔ جمہوریت کے پردہ میں ملوکیت کو فروغ دینے والوں کو

"وارث چنگیز و پرویز"۔ کمزور اور چھوٹے ممالک کو "برّہ معصوم" اور ان کو ہڑپ کرنے والے بڑے ممالک کو "گرگ" کہنا ایسی بہتر اور جامع استعارہ کی مثال ہے جو معنویت سے پُر ہے۔

خودی کا لفظ بھی اقبال کے یہاں ایک خاص مفہوم رکھتا ہے جو اس لفظ کے عام معنیٰ سے بالکل مختلف ہے۔ خودی کا لفظ اردو اور فارسی میں کبر و غرور اور نخوت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ تمام صوفی اور صوفی منش شعراء نے ہمیشہ اس کو بُرے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً

ہے خودی جب تک کہ انساں میں خدا ملتا نہیں

لہٰذا ہر ذی شعور نے اپنی خودی کو مٹانے اور فنا کرنے کی حتی الوسع کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوموں میں بے عملی۔ بے مرکزی اور بے اصولی پیدا ہو گئی۔ اور اس سے نہ صرف ان کی خودی فنا ہوئی بلکہ دنیا سے ان کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ اجتماعیت بھی انفرادیت کے ساتھ ختم ہونے لگی۔

اقبال اس لعنت سے عالم اسلامی کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت کا ہاتھ سے جانا قوت عمل کا فقدان ہے لہٰذا انھوں نے نظریۂ زندگی ہی بدلنے کا سامان پیدا کیا۔ اور اپنی شاعری کا ایک موضوع "خودی" کو قرار دیا۔ اہل تصوف خودی کو مٹانا ہی حاصلِ زندگی سمجھتے تھے لیکن اقبال نے خودی اور استحکام خودی کو "اصل نظام عالم" اور "تسلسلِ حیات و تعینات وجود" کا باعث ٹھہرایا۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے، راز درونِ حیات
خودی کیا ہے، بیداریٔ کائنات

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے خودی کے معنی کبر و غرور یا نخوت کے نہیں لئے۔ اقبال نے اس لفظ کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی تشریح یوں کی ہے۔ "یہ لفظ بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض "احساس نفس" یا "تعین ذات" ہے۔"

اقبال قطرہ کو دریا میں فنا ہونے کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ قطرہ کو دریا بن جانے کا سبق پڑھاتے ہیں۔ اپنے آپ کو فنا کرنے کی تعلیم نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اقبال نے خودی یعنی احساس نفس کے تصور سے مسلمانوں میں عمل و حرکت کی آرزو پیدا کر کے انھیں مردہ و افسردہ ہونے سے بچا لیا۔

خودی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک شیطانی دوسری یزدانی۔ شیطانی خودی تو وہ تھی جسکا نمونہ روز ازل ابلیس نے پیش کیا، اور وہ حکم حق سے

روگردانی کر کے ملعون و مردود قرار دیا گیا۔ انسان کو اس سے پرہیز لازم ہے۔ صرف یزدانی خودی کی تحصیل انسان کا مقصد حیات ہونا چاہیئے۔ اور اسی خودی کی تعلیم اقبال نے اپنے اشعار میں دی ہے۔

اصطلاحات اقبال کی شاعری قدیم شعراء کی طرح محض گل و بلبل کی داخلی شاعری نہیں بلکہ ان کی شاعری مقصدی ہے۔ انکا مقصد گری ہوئی پژمردہ قوم کو بیدار کرنا۔ طوق غلامی سے نجات دلانا اور عمل و حرکت کی آرزو پیدا کرنا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ہم مذہب کو چند رسمی اور روایتی باتوں کا مجموعہ جانتے ہیں اور اس کی حقیقت اور روح سے ناواقف ہیں۔ لہذا انھوں نے ہمیں قرآن کریم کی روشنی میں راہ ہدایت دکھائی اور مذہب کے صحیح معنی بتائے اور مذہب کی بہت سی اصطلاحیں کامیابی سے نظم کیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو پہلے سے اردو شعر و شاعری میں مستعمل ہیں۔ اور جنکا وہی قدیمی مفہوم اقبال نے بھی قائم رکھا ہے مثلاً۔ کافری۔ دینداری۔ پیرانِ حرم۔ مندر۔ پجاری۔ عرش بریں۔ ملت بیضا۔ طواف۔ حج۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ نماز۔ اذان۔ جماعت۔ حرم۔ توحید۔ جہاد۔ ید بیضا۔ مسیح۔ جمال۔ جلال۔ نور۔ کلیم۔ خلیل۔ معجزہ۔ وحی۔ زنار۔ مصحف۔ جبریل وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ ہزار ہا نئی اصطلاحیں اقبال کی اختراع کی ہوئی ہیں جنکی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔ حُدی خواں۔ افتراق بولہبی۔ شیوہ ہائے خانقاہی۔ بازیچۂ تاویل۔ رسم و راہ خانقہی۔ سرود ازلی۔ حضرت یزداں۔ فطرت احرار۔ قبا پوشی و کلہ داری۔ مجاہدانہ حرارت۔ علم لاہوتی۔ شیخ کلیسا۔

نماز بے قیام۔ محروم یقین۔ گلبانگ انا الحق۔ رسم شبیری۔ بوئے رہبانی۔ کلیم بے تجلّی۔ مسیح بے صلیب۔ فقر و راہبی۔ وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کی ہزارہا اصطلاحات اقبال کے کلام میں نہایت عمدگی اور صفائی کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں جس سے اقبال کی بلاغت طلاقت اور قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں ان اصطلاحات کی کثرت کے باوجود بھی زیادہ سے زیادہ شعریت موجود ہے۔

ان مذہبی اصطلاحات کے علاوہ اقبال کے یہاں کثرت سے سیاسی و فلسفیانہ اصطلاحات ملتی ہیں۔ اقبال کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے فلسفہ جیسی خشک چیز کو اپنے کلام میں اس طرح پیش کیا ہے کہ خشکی تو درکنار کچھ اس قسم کی رنگینی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کے اشعار بجائے خشک اور بے کیف ہونے کے پر مغز اور دلنشین ہوتے ہیں۔ اقبال بات ہی بات میں اہم مسائل کو نہایت رنگین طریقہ سے بیان کر دینے پر قادر ہیں۔ ایسی گہری مسائل کو جنکی تشریح و تفصیل میں فلسفیوں نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں، جنمیں الفاظ کے پیچ و خم کے علاوہ شاید ہی کہیں کام کی بات ملتی ہے، انہی مسائل کو اقبال نے استعاروں اور کنایوں میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ مسئلہ فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ مثلاً فی زمانہ جمہوری حکومت کے لاکھوں فوائد بتائے جاتے ہیں اور اس پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ آئے دن پارلیمنٹ میں اس کی حمایت میں تقاریر ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اقبال نے ایک شعر میں اس کی حقیقت کو یوں واضح کر دیا ہے:-

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جسمیں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اسی کی دوسری توضیح یوں کی ہے:-

ہے وہی ساز کہن مشرق کا جمہوری نظام
جسکے پردہ میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جسطرح اقبال کے کلام میں مذہبی اصطلاحات کی فراوانی ہے اسی طرح سیاسی اصطلاحات بھی ہزاروں کی تعداد میں نئے انداز کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً:- سرمایہ و محنت۔ رعایات۔ حقوق۔ جنگ زرگری دست دولت آفریں۔ جمہوری نظام۔ جمہوری قبا۔ مجلس آئین۔ اعضائے مجالس۔ نغمہ بیداریٔ جمہور۔ ملوکیت۔ مجلس شوریٰ۔ اشتراکیت۔ دہریت سلطانیٔ سجاوید۔ سیاست افرنگ۔ خواجگی۔ خوئے غلامی۔ ملوکیت پردیزہ مدنیت۔ طوق غلامی۔ رمز ملوکانہ۔ امیر قافلہ۔ آوازۂ تجدید وغیرہ۔ ان مشتے نمونہ از خروارے مثالوں پر نظر ڈالنے سے اور انکی گہرائی تک پہونچنے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال سیاست کے میدان میں بھی پیش پیش تھے۔ جسطریقہ سے انھوں نے سرمایہ داری کی لعنت۔ غلامی کی برائی اور جمہوریت کا پردہ فاش کیا ہے دیگر شعراء کے یہاں یہ پہلو نہیں ملتا ہے۔

اقبال کو ایک فلسفی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے مشرق و مغرب

کے بڑے بڑے مفکرین کا مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کے کلام میں بیشتر مقامات پر فلسفیانہ مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی ہے جنمیں فلسفیانہ اصطلاحات بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً :-

معرکۂ بود و نبود۔ نظام ہست و بود۔ طلسم شش جہت۔ زمان و مکان۔ صفات ذات حق۔ عین ذات۔ حادث۔ قدیم۔ قلب و نظر۔ فکر و نظر۔ عرفان۔ لازمانی۔ وحدت افکار و کردار۔ مشاہدہ۔ ثبات۔ بقا۔ فنا۔ نقش گر حادثات۔ غیاب و حضور۔ مقام کبریا۔ طلب صادق۔ انداز آفاقی۔ مقامات آہ و فغاں۔ نشاط رحیل۔ فکر حکیمانہ۔ گرمیٔ افکار۔ اندیشۂ بیباک وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں تنوّع الفاظ۔ تشبیہات و استعارات۔ اصطلاحات۔ مذہب۔ فلسفہ اور سیاست کثرت سے موجود ہے جس نے خزانۂ اردو کو مالا مال کر دیا ہے۔

اقبال کا شاہین

از

جناب مغیث الدین صاحب فریدی "ادیب کامل"

نائب معتمد بزم اقبال آگرہ

اقبال کی جدت طرازی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو اسالیب و موضوع کے علاوہ نئی نئی تمثیلات کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ وہ شخص جو نظام قدرت میں بھی ندرت اور تنوع دیکھنا چاہے اور رات دن کی یکسانیت سے اُکتا کر خدا سے یہ کہدے :-

طرح نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

وہ اردو یا فارسی کی فرسودہ اور پامال تمثیلات - بلبل - کبک ، طاؤس وغیرہ کا محتاج کیوں رہتا - یہ اس کے زبردست جذبۂ تخلیق کا فیض ہے کہ اس نے اپنے پیغام کی وضاحت اور اپنے بلند مقاصد کی تشریح کے لئے شاہین، شہباز اور عقاب کی تمثیلات سے کام لیا - یہ تینوں چیزیں بالکل اچھوتی نہیں ہیں - اردو فارسی میں اکثر جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اقبال نے ان کے ذریعہ سے جس مقصد کی وضاحت کی ہے اُس

مقصد کی اہمیت نے ان تمثیلات کی وقعت بڑھادی ہے۔

اردو کے اساتذۂ قدیم کے کلام میں شاہین کا ذکر جس حیثیت سے کیا گیا ہے وہ کچھ ایسی مضحکہ خیز ہے کہ شاہین کے نام سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

مرغ عصیاں اُڑ گئی صید باز رحمت ہوگیا
دنگ شاہین ترازوئے عدالت ہوگیا (لاعلم)

تیر سے تیری کوئی طائر نہ چھوٹا دہر میں
رہ گیا تو ایک شاہین ترازو رہ گیا! (اسیر)

چھپ رہا ہے قفس تن میں جو ہر طائرِ دل
آنکھ کھولے ہوئے شاہین نظر کسکا ہے (لاعلم)

یا شہباز کیلئے حضرتِ آتش فرماتے ہیں:۔

تو نے زلفوں کو اُلجھ پڑنے سی منڈوایا جو یار
شاہبازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

یہ اور اس قبیل کے متعدد اشعار اردو کے دواوین میں مل جاتے ہیں۔ فارسی میں خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:۔

شہپر زاغ و زغن شایان قید و بند نیست
ایں کرامت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

مگر اقبال کے کلام میں شاہین کا ایک خاص تصور ملتا ہے جو ان کے مخصوص تصوّرِ خودی کا تابع ہے۔

"شاہین ایک بلند پرواز، تیز نظر، تنومند، جفاکش، غیور اور بلند فطرت

پرندہ ہے"۔ اقبال اس کی جملہ خصوصیات میں سے خونریزی کے عنصر کو حذف کر کے پیش کرتے ہیں۔ اور یہی ان کے نزدیک صحیح مردِ مومن کا کردار ہے۔ بلند نظری اور ذوقِ عمل۔ یہ تصور ان کے ہاں اس قدر تابناک ہے کہ جب وہ شاہین کی زبان سے اس کی سیرت بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی خونریزی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے۔

شاہین کہتا ہے:۔

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو ۔ ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں ۔ کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ۔ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کے مسلک میں شباب تن آسانی اور تن پروری کا نام نہیں ہے بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنا شباب کی صحیح تعریف ہے۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخوردہ ۔ اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
اے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام ۔ سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پہ جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبال صوفیائے سلف کی تعلیم نفی خودی سے بیزار ہے۔ وہ قوم کی پستی و زوال کا سبب اسی غلط تعلیم کو قرار دیتا ہے۔ "مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید" کا سبق

دینے والے کو وہ "گوسفند از گوسفندان قدیم" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ وہ اپنے زبردست جذبۂ تخلیق کی مدد سے خودی کو ایک نہایت ارفع اور اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ اس کی حکیمانہ بصیرت، فلسفیانہ استدلال اور شاعرانہ انداز بیان خودی کے لفظ سے غرور و خود پسندی کا مفہوم چھین کر اسے احساس نفس یا تعین ذات کے معنی پہنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک استحکام خودی اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرنا اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ اور جب قوم کے نوجوانوں میں خودی کا احساس نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جدید طریقۂ تعلیم سے اقبال سخت متنفر ہے۔ تہذیب جدید اور تقلید فرنگ کے فیض سے وہ قوم کے نوجوانوں کو بے عمل، بزدل اور غلام دیکھ کر ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے ذمہ دار حضرات کو ان کے فرائض کا احساس دلاتا ہے۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں پاکبازی کا

بعض مغرب زدہ حضرات اقبال کے مقاصد آفرینی کے تصور کو برگسان کے جوش حیات اور ارتقائے تخلیقی کا عکس بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برگسان نے نفس انسانی کی تخلیقی وحدانیت کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک نفس انسانی کی تخلیق کا محرک روحانی جذبہ ہوتا ہے۔ اقبال کی مقاصد آفرینی خالص روحانی

ہے۔ اور اس تہذیب نفس کی مرہون منت ہے جو مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے۔ یہی تہذیب نفس جب اقبال کے سامنے مرد مومن کا تصور پیش کرتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

اقبال نطشے کا شاگرد ہے اس وجہ سے کہ وہاں بھی اسے اپنے نقطۂ نظر کی تائید ملتی ہے۔ نطشے بھی استحکام خودی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس کے لیے "قلب او مومن دماغش کافرست" کہتا ہے۔ وہ آدمی کا اس لیے مداح ہے کہ رومی عقل سے زیادہ عشق پہ ایمان رکھتا ہے۔ اور یہی اقبال کا مسلک ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اس کا عشق اس سے مختلف ہے وہ ایسا عشق چاہتا ہے جو جذبۂ تسخیر، جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا کے کامیاب امتزاج کا نتیجہ ہو۔

ندارد کار بادوں ہمتاں عشق تدرو مردہ را شاہیں نگیرد

عقاباں را بہائے کم نہد عشق تدروان را بہ بازاں سر دہد عشق
نگہ دارد دل ما خویشتن را دلیکن از کمینش بہ جہد عشق

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔ مگر اس کیلئے

بیدار دل کی ضرورت ہے۔

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

اقبال کو جمود سے نفرت ہے وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں حرکت اور عمل کا جذبہ بیدار کرنا چاہتا ہے اور جب ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت سے مسلمان کو متاثر دیکھتا ہے تو کس انداز سے نشتر زنی کرتا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

خودی کی سعی پیہم روح کو اندرونی اور وجدانی طور پہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے تیار کرتی ہے۔ اور یہ مقاصد کی روشنی مستقبل کی تصویر کو حال کے آئینہ میں پیش کر سکتی ہے۔ مگر اس کیلئے جس ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تعلیم اقبال یوں دیتا ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قرآن پاک میں جگہ جگہ اس امر پہ زور دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال و

افعال کا ذمہ دار خود ہے۔ (لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ) اسی کی تفسیر اقبال بڑے دلچسپ پیرایہ میں یوں کرتا ہے۔ کہ جب ابو العلاء معرّی کو بھنا ہوا تیتر پیش کیا گیا تو اس نے تیتر سے یوں کہا:۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اسلام نے انسان کے تصور اور ارادہ کو آزاد رکھا ہے۔ تاکہ ہر شخص اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اقبال اسی تعلیم کو اپنے الفاظ میں یوں سناتا ہے۔

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسلام نے جو مرد مومن کا معیار پیش کیا ہے۔ اس پر جب مسلمان پورا نہیں اترتا تو اقبال اسے اس طرح غیرت دلاتا ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

اس بیباکی اور بلند ہمتی کی تعلیم دیتے ہوئے اقبال قوم کے افراد میں خود اعتمادی۔ غیرت اور بلند آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

علم و عقل سے زیادہ اقبال عشق کا پرستار ہے۔ وہ خشک فلسفیانہ مسائل سے ہمیشہ بیزار رہا ہے۔ محض فلسفہ کو وہ زندگی سے دوری کہتا ہے۔ اور اسکا یہی نظریہ فلسفی کو کرگس اور مردِ قلندر کو شاہین بنا کر پیش کرتا ہے۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

علامہ اقبال کا پیغام

از

جناب مولوی محمد مظفر علی صاحب طالب ایم اے
سکنڈ ماسٹر سینٹ جانس ہائی اسکول آگرہ

علامہ اقبال نے جس صراحت اور وضاحت کے ساتھ امت مسلمہ کے جمود اور پستی سے متاثر ہو کر احساس خودی یعنی خود شناسی اور معرفت نفس کا پیغام پہونچایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گویا بالفاظ صاحب سیرت اقبال "اس مجدد عصر نے گوسفندان قدیم کی غلط اور تباہ کن تعلیمات کو توڑ کر رکھ دیا اور اسلام کا وہ عالمگیر پیغام جو عالم بشریت کا واحد نجات دہندہ ہے ببانگ دہل ملت مسلمہ، اقوام مشرق اور تمام دنیا کو پہونچا دیا تاکہ اس "سرود رفتہ" اور "نغمہ حجازی" کو سن کر "عروق مردہ مشرق" میں پھر "خون زندگی" دوڑنے لگے اور یہ مردہ و خفتہ قوم پھر سے زندہ و بیدار ہو کر اقوام عالم میں اپنی جائز اور حقیقی جگہ حاصل کر سکے"۔

خودی سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی کمالات اور فطری تاثرات سے خبردار ہو کر عملی طور پہ ان کی حفاظت اور ان سے استفادہ کا

ذمہ دار ہو۔ اس تعلیم خودی اور احساس نفس سے شیطانی خودی کی تعلیم ہرگز مقصود نہیں جسکا مظاہرہ روز ازل میں شیطان نے کیا تھا کہ معبود حقیقی کے حکم سے سرتابی کر کے گناہ عظیم کا مرتکب ہوا، اور آدم خاکی کو سجدۂ اطاعت نہ کیا۔ نخوت وغرور کا پتلا بن کر ناری ہوا اور شیطانی خودی اور تکبر میں پھنس کر خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بنا۔

یزدانی خودی مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ میں مضمر ہے پس جب انسان کو اس خودی کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قوتوں اور لیاقتوں کو پہچاننے لگتا ہے تو یہی یزدانی خودی اس کو تمام بری باتوں اور ناپاک عادتوں سے محفوظ کر کے مرد باخدا بناتی ہے اور اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا مصداق ٹھیراتی ہے۔ قربت الٰہی کا طرۂ امتیاز سر پہ رکھتی ہے اور انسان ضعیف البنیان کو جن و ملائک سے رتبہ میں سربلند کرتی ہے۔ پس شیطانی خودی سے انسان کو پرہیز کرنا چاہیئے اور یزدانی خودی کی تحصیل کو اپنا مقصد حیات بنانا چاہیئے۔ اور اسی یزدانی خودی "احساس نفس" اور خودشناسی کا پیام علامہ اقبال نے اپنی اشعار میں دیا ہے۔ خودی کو کمال تک پہنچانے کے لئے "عزت نفس" اور "ضبط نفس" دو نہایت ضروری شرائط ہیں۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک ست

ضعف و قوت کے فلسفہ اور غالب و مغلوب کی بحث کی بابت علامہ اقبال "بال جبریل" میں فرماتے ہیں:-

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی[1]
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوان تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران[2] و لزومات[3]
اے مرغک بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جسکی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

علامہ اقبال نے محسوس کیا کہ خودی کا استحکام بقائے حیات اور حفظ ناموس کیلئے حد درجہ ضروری ہے۔ اگر قوم اور ملک کو اس انجماد اور پستی میں غوطے کھاتا چھوڑ دیا گیا اور ان کے اندر اپنی خودی کا احساس پیدا نہ کیا گیا تو وہ مذلت اور بربادی کے سمندر میں ہمیشہ کے لئے تہ نشین ہو جائیں گے۔ وہ قطرہ کو دریا میں فنا ہونے کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ قطرہ کو دریا بن جانے کا سبق

---

[1] ابو العلاء معرّی عربی زبان کا مشہور شاعر۔ [2] معرّی کی مشہور تصنیف [3] معری کا مجموعہ قصائد۔

پڑھاتے ہیں تاکہ اپنی لیاقتوں اور طاقتوں کے احساس کے بعد مسلمانوں میں عمل و حرکت کی آرزو پیدا ہو اور وہ افسردگی بلکہ مردگی کے ننگ و عار سے محفوظ ہو جائیں۔

اب آپ ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں خودی اور تکبر کے فرق کو ملاحظہ فرمایئے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ میگوئی
من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است

من از بود و نبود خود خموشم — اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادہ کیست — کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

تو را نرِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اقبال کا انسان بلاشبہہ خود پرست ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ خود پرستی میں محو ہو کر خدائی اختیارات کو بھول نہیں جاتا۔ جہاں یہ انسان خودی کا خلاق ہے وہاں اپنے آپ کو تجلیات الٰہی کے ظہور اور مشاہدہ ذات کا زینہ بھی بناتا ہے اس طور پہ یہ حرم کی تعمیر تو کرتا ہے لیکن بت پرستی کی جانب مائل ہو کر شرک عظیم کا مرتکب نہیں ہوتا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

برون از ورطۂ بود و عدم شو فزون ازیں جہان کیف و کم شو
خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش چو ابراہیمؑ معمارِ حرم شو

بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

صوفیان باصفا خودی کو مٹانا حاصلِ زندگی تصور کرتے تھے لیکن اقبال نے استحکام خودی کو ذریعہ حصول قربت الٰہی ٹھیرایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

زمن گو صوفیانِ باصفا را خدا جویانِ معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم کہ با نورِ خودی بیند خدا را

خودداری اور ہنرمندی ایسے اوصاف ہیں جن کی موجودگی قوم کی زندگی کیلئے ضروری اور لازمی ہے۔ فرماتے ہیں:

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے قیمت میں یہ معنی ہے درِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ بادشاہی

خودی کی ہمہ گیری دیکھئے :-

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس کی وسعتوں کو اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگ خارہ نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں

جب انسان کو خودی کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی لیاقتوں کو سمجھنے لگے تو پھر علامہ نے دوسرا پیغام عمل کا دیا ہے۔ عمل کے بیانوں سے تلاش و جستجو کی ترغیب اور اپنی قوتوں اور لیاقتوں کے استعمال کا ذوق و شوق پیدا کیا ہے۔ علامہ نے جتنا عمل اور سخت کوشی پر اپنے کلام میں زور دیا ہے کسی دوسری

چیز پہ نہیں دیا۔ آپ کا فارسی کلام دیکھئے یا اردو پر نظر ڈالیے، "مثنوی اسرار و رموز" دیکھئے، یا پیام مشرق و زبور عجم ملاحظہ کیجئے، یا جاوید نامہ، ہر ایک تصنیف میں عمل کی تعلیم اسی زور و شور کے ساتھ دی گئی ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں تحریر فرماتے ہیں:-

اے ز جور چرخ ناہنجار تنگ — جام تو فریادی بیداد سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمون حیات — لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہان نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن

ڈاکٹر صاحب اپنے خود دار انسان کی کوششوں کو صرف اسی جہان کی حدود میں محدود نہیں کرنا چاہتے وہ اس کی ہمت کو بلند اور ارادہ کو رفیع بنا کر قوت تسخیر اور جودت طبع کو کھلی ہوئی دعوت دیتے ہیں کہ مصیبت اور آفات سے خائف نہ ہو کر راہ ترقی پہ گامزن ہو تاکہ کوشش و سعی کے قدم ایک دم کو نہ رکنے پائیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزل اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا

عمل کی سرگرمی اور سخت کوشی کا مزہ کچھ ایسا دلپذیر ہے کہ ڈاکٹر صاحب خطرہ کو ذریعہ حیات تصور کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

"اگر خواہی حیات اندر خطر زی" یا "حیات جاوداں اندر ستیز است"

اور راستہ کی پیچیدگیوں ناہمواریوں ہی کو اپنے لئے وسیلۂ کامیابی سمجھتے ہیں۔ سیدھا صاف ہموار راستہ ان کے جذبہ سخت کوشی کو مطمئن کرنے کیلئے ناکافی اور اس لئے ان کو ناخوشگوار ہے۔

خیال او درون سینہ خوشتر — غمش افزودہ جاں کاہیدہ خوشتر
مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت — ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

ڈاکٹر صاحب کو آرام طلبی ایک نظر نہیں بھاتی اور آپ اپنے مخاطب کو عمل پیہم کی تلقین فرماتے ہیں۔

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز
از سر تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست
اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

دیکھئے ترغیب عمل کے لئے اس سے زیادہ موثر الفاظ اور کون سے ہو سکتے ہیں

من آں علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

ہمت کی بلند پروازی اور جستجو کی بیتابی دیکھئے۔

نگردد زندگانی ختہ از کار جہانگیری جہاں در گرہ بستم جہاں دیگرے پیش است

سوز و گداز زندگی لذت جستجوئے تو راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

چناں زی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

یعنی زندگی میں وہ شان پیدا کرلے کہ خود خدا کو ایسی زندگی کو ختم کرنے اور بتلائے موت کرنے پر تامل اور ندامت ہو کہ کیوں ایسی مایۂ ناز ہستی کو جو اپنی ہمت اور کوشش سے فرشتوں پر فوقیت رکھتی تھی موت کی نیند سلایا۔ بال جبریل میں یہی خیال ایک انوکھے انداز میں نظم فرمایا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ڈاکٹر صاحب شوق عمل میں اندیشہ سود و زیاں کو بھی دل میں نہیں آنے دیتے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

کسی پست ہمت کو ابھارنے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر نصیحت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بال جبریل میں بزبان عقاب سالخوردہ بچہ شاہین کی ہمت افزائی فرماتے ہیں:-

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر — وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

موقعہ کی مناسبت سے اپنے آپ کو اسی سانچہ میں ڈھالنا جو ماحول کے مناسب ہو مصاف زندگی میں کامیابی کا راز ہے۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر — شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں میں — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ایک اور جگہ اسی حقیقت کو اس طرح آشکار فرمایا ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عمل کے لئے ایمان اور یقین روح رواں ہیں۔ یقین ہی سے انسان کی زندگی کامیاب ہوتی ہے اور اسی سے فلاح و کامیابی کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ یقین کو پختہ کرلے تو پھر ڈاکٹر صاحب کے فرمانے کے مطابق

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

دیکھئے یقین کی کارفرمائی سے کیا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

یہ صرف یقین ہی کی شمشیر براں ہے جو غلامی کی زنجیریں کاٹ کر رکھ دیتی ہے اور انسان کو آزاد کر دیتی ہے دیکھئے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

حقیقت میں یقین اور ایمان دو مختلف چیزیں نہیں ہیں ذرا ایمان والے کا زور بازو ملاحظہ ہو

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایمان سے آدمی کو سلطنت حکومت علم اور دنیوی جاہ و اعزاز سب ہی کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔

ولایت، بادشاہی علم اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

دیکھئے جہاد زندگانی میں عمل اور یقین کے امتزاج اور اس کے ساتھ محبت کی آمیزش سے انسان فاتح عالم کے لقب سے ملقب ہوتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

جب انسان عمل کے لئے کمر ہمت کس لیتا ہے تو دنیا کے قاعدہ کے موافق چند چیزیں ایسی اس کے سامنے آتی ہیں جو عمل کیلئے سدراہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی حقیقت بیں نظر اس نکتہ تک پہونچ گئی اور انھوں نے اپنے اشعار میں اپنے خود دار انسان کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جستجو اور عمل کیلئے قناعت بالکل حرام ہے۔ فراخی حوصلہ اور بلندی ارادہ اگر حائل ہو تو ضروریات کے لئے راستے خود بخود نکل آئیں گے۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
دفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

دوسری رکاوٹ پیدا کرنے والی چیز "منزل کا تخیل" ہے چونکہ منزل پر پہونچکر جذبات انسانی مردہ ہو جاتے ہیں لہذا انسان کو منزل پر پہونچکر ذوق و شوق میں کمی نہ کرنا چاہئے جیسے کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

من از ذوق سفر آنگونہ ستم کہ منزل پیش من فرسنگ رہ نیست

تیسری چیز خوف و ہراس ہے اس سے بھی انسان کی عملی قوتیں ٹوٹ جاتی ہیں

لہذا خطرات کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہیئے۔ اور اپنی سعی و جستجو میں ذرہ برابر کمی نہ آنے دینا چاہیئے۔ اسی میں زندگی ہے۔ ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔

دمادم خویشتن را بر فسان زن ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است عیار ممکنات جسم و جان است

ڈاکٹر صاحب کے پیغام عمل و سخت کوشی کا خلاصہ یہ ہے۔

"ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا قوم کی موت ہے۔ دل سے ڈر اور خوف نکال دو۔ دریاؤں اور چٹانوں سے ٹکر لو۔ زندگی کوشش عمل اور تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔"

پیام عمل کے اس بیان کو میں اس واقعہ کے اعادہ پر ختم کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ ایک بے روزگار نوجوان ڈاکٹر صاحب کی خدمت حاضر ہوا اور اپنی بیکاری کا رونا رونے لگا۔ جب وہ نوجوان دیر تک ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنا دکھڑا روتا رہا تو آپ نے اس سے یوں ارشاد فرمایا:۔

"انسان دنیا میں عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ہر انسان چھوٹی سی حیثیت میں بھی خود پیدا کرنے والا ہے۔ اور وہ قوتیں جنھیں عمل میں لا کر وہ روزی پیدا کر سکتا ہے۔ انھیں ضائع کرنا گناہ ہے۔ تم کامیابی اور ناکامی پر نظر نہ رکھو۔ اپنے پیدا ہونے کے مقصد کو جانو اور کوشش کیے جاؤ کامیاب ہو گے۔"

بخلاف دیگر شعرا کے علامہ اقبال کی ساری شاعری پیامی شاعری ہے۔ آپ اپنی شاعری کے ذریعہ سے خاص مقاصد کی تبلیغ اور اشاعت فرماتے ہیں۔

اور لوگوں کو ترقی اور کامیابی کی شاہ راہ بتاتے ہیں۔ خودی اور عمل کے پیامات پہونچانے کے بعد وہ نصیحت فرماتے ہیں کہ اِس کارخانہ عالم میں انھیں اشیاء کے حصول کے لئے سخت کوشی اور محنت کرنا چاہئے جو سود مند اور منفعت رساں ہیں۔ وہ اپنے خود دار اور عمل کوش انسان کو اپنے دلکش پیرایہ، اور نادر انداز میں بعض دوسرے ضروری پیغام بھی سناتے ہیں۔ اس ذیل میں پہلے عالمگیر اخوت، وطینت و مساوات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

علامہ اقبال کا گویا تیسرا پیام یا آپ کے پیام کا تیسرا رکن یہ ہے کہ اتفاق کی زندگی بسر کرو۔ مل جل کر رہو۔ عالمگیر اخوت اور سچی مساوات کا جذبہ تمہاری زندگیوں میں سرایت کر جائے۔ کیونکہ اگر یہ صادق جذبہ تمہارے اندر کارفرما نہو گا تو خواہ مخواہ کے جھگڑے آئے دن کے قضیے کھڑے ہوتے رہیں گے۔ اور تمہارے امن و اطمینان کو خاک میں ملا دینگے، اس عالمگیر اخوت، اتفاق اور جمعیت کا مقصد اور مآل، کشور کشائی اور ملک گیری کی ہوس ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس سے ظلم اور بدنامی کی اشاعت ہوتی ہے۔

حقیقت میں عالمگیر اخوت سے نیکی، جمہوریت، آزادی رائے اور مساوات کی تعلیم مقصود ہے جس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے علامہ مرحوم کا ایک مضمون قوم و ملت کے نظریہ پر مارچ ۱۹۳۸ء میں انتقال سے کچھ پہلے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ آپ اپنے اس معرکہ آرا مضمون میں فرماتے ہیں "اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن و سلامتی اور اُن کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے

تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی پیدا کرتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص اسلامی ضمیر کی تخلیق کرے جس سے عالم انسانی کی خدا بانی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔"

"قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن "ملت" سب جماعتوں کو توڑ کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنا لیتی ہے۔ گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔"

قرآن کریم میں آیا ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔ کیا بارگاہ خداوندی سے اُمت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ اسکی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا۔ امت مسلمہ کے مقابل تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کی ہے۔"

"نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ

قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلاف کو تسلیم کر لینے کے ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے، جو زبان، مکان، وطن، قوم نسل نسب، ملک وغیرہ کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدی، یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں پر پہونچنے تک معلوم نہیں حضرت انسان کو کتنی صدیاں لگیں۔ مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے میں اور باوجود شعوبی، قبایلی، نسلی اور لسانی امتیازات کے ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔"

چنانچہ بالفاظ صاحب سیرت اقبال "متذکرہ بالا توضیح سے معلوم ہو گیا کہ سر اقبال اس ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے قائم کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں جو جغرافیائی حدود کی پابند نہیں جو ہندوستان اور ایشیا، یورپ اور امریکہ ہی کا نہیں بلکہ تمام کائنات کا احاطہ کر سکتی ہے اور جو اپنی ہمہ گیری کے باعث ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کا واحد حل ہے"۔ اسلام نے نسل و نسب اور ملک و رنگ کے امتیازات کو مٹا کر ایک "وحدت قومی" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ تمام ملت اسلامیہ یک ذات و یک جہت ہے اور یہ اخوت

وہ ہی جس سے بہتر مثال آج تک تاریخ عالم پیش نہ کر سکی علامہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

جواب شکوہ کا ایک بند ملاحظہ ہو کیسے بلاغت آئین الفاظ میں فرماتے ہیں کہ ہم کیا تھے، ہمیں کیا ہونا چاہئے اور شومی اعمال سے کیا ہو گئے :-

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

گویا اخوت اسلامیہ کو جو نقصان فرقہ بندی ذات پات کی تفریق اور قومیت سے پہونچا ہے وہ بلائے آسمانی سے کسی طرح کم نہیں۔ پس ہر مرد مومن کا یہ فرض اولین ہونا چاہئے کہ ان خیالات کا قلع قمع کر کے امت کو عز و وقار کی شاہراہ پر گامزن کرے۔ علامہ بلا کسی استثنا کے فرماتے ہیں :-

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

نہ افغانیم نے ترکِ تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ — وائے بر تو انچہ بودی ماندۂ
فارغ از باب و ام و اعمام باش — ہمچو سلماں رضؓ زادۂ اسلام باش
گر نسب را جزو ملت کردۂ — رخنہ در کار اخوت کردہ
عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

فلاح و بہبودی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

یہ اسلامی نظریہ ہی نہیں، آئین ملت کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سب ہوس کی

کارفرمائیاں ہیں۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

امت مسلمہ کے افراد کو اپنی امتیازی خصوصیت باقی رکھنا چاہئے، اقوام مغرب کے قیاس پر اپنی ملت کو قیاس نہ کرنا چاہئے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

وطنیت کے نظریہ کی بابت علامہ اقبال اپنے متذکرہ بالا مضمون میں فرماتے ہیں۔ میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم

ہوگئی تھی کہ یورپ کے ملوکانہ اغراض اس امر کے متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اسی کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانہ کا اُلٹ پھیر بھی عجیب ہے ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے۔ اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں ..... افسوس ..... یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں قابل اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن کا لفظ جو اس قول میں استعمال میں ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں۔ اور کل کچھ، کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے۔ اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حبّ الوطن من الایمان کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ

وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں، مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ ------

چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

اقبال نے وطن کے اس سیاسی تصور کو زہر ہلاہل جان کر سخت مخالفت کی ہے۔ اسی مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں.... دوسرے مسلمان۔ سو افسوس ہے کہ ان سادہ لوحوں کو اس نظریہ وطن کے لوازم اور عواقب کی پوری حقیقت معلوم نہیں، اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین اور وطن" بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو "لادینی" ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اسکے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔" ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ علامہ وطنیت کے سیاسی نظریہ کے کیوں مخالف ہیں۔ اور وطن کا وہ مفہوم کونسا ہے جس کے لئے آپ ترانہ ہندی، قومی گیت، اور اسی قسم کی ہندوستان کے متعلق دوسری نظمیں ارشاد فرماتے تھے، ملاحظہ ہو:-

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہوگی داستانوں میں

دکھادونگا میں اے ہندوستاں رنگ وفا سب کو
کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کرکے چھوڑوں گا

ہندیاں با یکدگر آویختند — فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد در نزاع کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

علامہ اقبال نے وطن کے اس سیاسی نظریہ کی بے انتہا مخالفت فرمائی ہے۔ اوپر کا خیال دیکھئے کس طرح جامعیت کے ساتھ ان اشعار میں ادا فرمایا ہے۔

لرد مغرب آں سراپا مکر و فن — اہل دیں را داد تعلیم وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق

تو اگر داری تمیز خوب و زشت
دل نہ بندی با کلوخ سنگ و خشت
چیست دین برخاستن از روے خاک
تا ز خود آگاہ گردد جان پاک
می نہ گنجد آں کہ گفت اللہ ہو
در حدود ایں نظامِ چار سو

عالمگیر اخوت، وطنیت کے ساتھ ہی اگر مساوات کی تھوڑی سی تفصیل اور اس کا صحیح مفہوم پیش نظر نہ کر دیا جائے اور زمانہ موجودہ کی عام روش سے اس کو ممتاز کر کے نہ بتایا جائے تو بڑی فروگذاشت ہو گی۔ اقبال کی معرکہ آرا نظم "شکوہ" سے میں ایک بند پیش کر کے اسلامی مساوات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہوں ہی وہ قوانین ہیں جن کی پابندی سے مساوات کو زندہ اور قائم رکھا جا سکتا تھا مگر افسوس ہے کہ آج ہم نے انھیں احکام سے سرتابی اختیار کر رکھی ہے اور نتیجہ ظاہر ہے۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یورپ کی پیش کردہ مساوات مقاصد اسلامی کے سراسر خلاف ہے بالفاظ صاحب پیام اقبال "موجودہ مساوات کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن حقیقت ان دونوں کی ایک ہے دونوں تن پروری اور استبداد کی تعلیم دیتی ہیں۔ دونوں کی سرگرمیاں مادّی اشتراک اور ظاہری

نشو ونما تک محدود ہیں، دونوں کا مذہب وایمان سرمایہ کی حمایت ہی میں غرق ہے دونوں ایک ہی چاہ ضلالت کی طرف لے جانے والی ہیں، دونوں کی تعمیل ہلاکت اور موت کو ہاتھ میں لے لینا ہے۔ دونوں کی تشکیل وتولید عقل و تدبیر کی فسوں کاریوں سے ہے لیکن اس کے بالمقابل اسلامی مساوات کی بنا عشق اور سوز باطن پر ہے، روحانی ملاپ میں ہے، اس کا مقصد اخوت اور محبت کی تجدید کے سوا اور کچھ نہیں - اس کا معیار شرافت صرف تقویٰ اور حسنِ سلوک ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ علامہ کی شاعری انبساطی اور ہنگامی ہرگز نہیں وہ ایک سلسلہ مربوط کے ساتھ مرد مومن کے لئے ایک بے نظیر لائحہ عمل پیش فرماتے ہیں جس سے صحیح اسلامی زندگی ترتیب پا سکتی ہے اور ان مواعظ اور نصائح پر کاربند ہو کر انسان دینی اور دنیوی ثمرۃ حاصل کر سکتا ہے۔

جس کتاب پر ناشر اور مرتب کے دستخط ثبت نہوں جعلی سمجھی جاوے۔

دستخط ناشر
بشیر احمد شاہ

دستخط مرتب
محمد طاہر فاروقی

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷	۳	کام فرسائی	گام فرسائی
۳۱	رباعی	عارض	عارف
۳۷	۷	اختیار وخبر	اختیار وجبر
۶۷	۱۶	سدِّ راہ	سدِّ رہ
۸۳	۱۵	پر	بر
۹۳	۴	اعتبار	اعتنا
۱۲۶	۱۱	کرو پار	کردیا
۱۵۰	۱۰	حیدرآباد دکن)	(حذف سمجھیے)
۱۵۳	۱۶	نصب، لعین،	نصب العین
۱۵۷	۱۲	شغال	سفال
۱۶۶	۷	دم	روم
۱۶۷	۱۸	قصر	قعر
۱۶۸	۹	خودشا	خودشناسی
۱۷۳	۱۴	بالا	باید
۲۰۲	۱۹	رسیدی	رسی دیں
۲۰۸	۱۹	اند	اندر
۲۱۹	۱۶	نکات	زکات
۲۴۳	۸	آدمی	رومی

ہماری مطبوعات

مآثرِ عجم — فارسی زبان و ادب، نثر و نظم، کی جامع تاریخ اور تبصرہ۔ مولفہ محمد عظیم الحق جنیدی ایم۔ اے
مع پیش لفظ از پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایم اے ... ... ۲؍

نقد و نظر — ۲۵ سے زیادہ شاعروں، نقادوں، زباندانوں اور شارحوں پر انتقاد و تبصرہ
مصنفہ مولانا حامد حسن قادری ... ... ۳؍

ادبی مقالات — مختلف شعرا اور نثر نگاروں پر تنقید۔ نیز دیگر تحقیقی و تنقیدی مضامین۔
از مبشر علی صدیقی ایم۔ اے۔ مع پیش لفظ از پروفیسر آل احمد سرور ایم اے ۲؍

حسرت موہانی — جامعیت، وسعت اور صحت تنقید کے اعتبار سے حسرت موہانی کی سیرت اور
شاعری پر پہلی تصنیف مع انتخاب کلام از پرنسپل عبدالشکور ایم۔ اے۔ ... ... ۲؍

ایرانی افسانے — ایرانِ نو کی ادبیاتِ جدیدہ کے بہترین افسانہ نگار سعید نفیسی کے طنزیہ و مزاحیہ منتخب
افسانوں کا ترجمہ۔ مزاحیات کا یہ طرز نگارش اردو میں ابتک موجود نہیں ہے۔ مترجمہ مولانا حامد حسن قادری ۲؍

نئے اور پرانے چراغ — (زیر طبع) پروفیسر آل احمد سرور ایم۔ اے کے بلند پایہ تنقیدی مقالات کا مجموعہ
جو ادب اردو میں جدید اور گراں بہا اضافہ ہے اور جس کا شائقین کو انتظار تھا

چند تنقیدیں — (زیر طبع) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ایم اے کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو اردو کے ممتاز
رسائل نگار، جامعہ، اردو، ہمایوں وغیرہ میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں

شہد کے کرشمے — شہد کے مختلف طریقوں سے استعمال اور اس کے کثیر فوائد پر اردو میں پہلی مستند
کتاب، مصنفہ سید واجد حسین ایم۔ اے ... ... ۲؍

زچہ بچہ کا امرت (یعنی شہد) — تمام بیماریوں کا شہد سے علاج اور مجرب و آزمودہ نسخے۔
مصنفہ سید واجد حسین ایم۔ اے۔ ... ... ۱۴؍

شہد کے چٹکلے — (زیر طبع) موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کو "زچہ بچہ کا امرت" کا دوسرا حصہ کہا
جا سکتا ہے۔ مصنفہ سید واجد حسین ایم۔ اے ... ... ۲؍

نیو لائٹ آن بدک ریز — آرین نسل کے مرکز اور اسرائیل کے گم شدہ قبیلوں کی بابتہ بالکل
جدید نظریہ۔ از حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ (انگریزی میں) ۸؍

سوفزم — اسلامی تصوف کیا ہے؟ مدارج سلوک کیونکر طے ہوتے ہیں؟ اسلام اور دیگر مذاہب کے تصوف میں
کیا فرق ہے؟ از حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ (انگریزی میں) ... ... ۱۲؍

(ہاشمی شمسی پریس آگرہ میں چھپا)
شاہ اینڈ کمپنی حکیم وصی روڈ۔ آگرہ